دار المصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۹ ماہ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۱۲ء عدد ۵

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم ہے۔ ابتداء ہی سے اسے اسلامیان ہند کی متحدہ آواز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ گذشتہ صدی میں آٹھویں دہے کے ابتدائی دنوں سے حکومت اور عدلیہ کی سطح پر ایسے فیصلے کیے جارہے ہیں جن کی زد براہ راست مسلم پرسنل لا پر پڑتی تھی اور اس کے نتیجہ میں وہ مقاصد بری طرح متاثر اور مجروح ہورہے تھے جن کی ضمانت شریعت ایپلی کیشن ایکٹ میں دی گئی تھی۔ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت مسلسل ایسے اقدامات کیے جارہے تھے جن سے ملک میں یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کی راہ ہموار ہو۔ مسلمانوں کے ذہنی اور ملی تشخص کی حفاظت اور بقا کے لیے اس صورت حال کے مضمرات باعث تشویش ہی نہیں نہایت خطرناک تھے۔ ملی قیادت نے صورت حال کی سنگینی اور اس خطرہ کے سد باب کے لیے فوری اقدام کی ناگزیر ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اس کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ ابتداءً اس کا دائرہ کار پرسنل لا سے متعلق معاملات تک محدود تھا۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اس کے میدان کار میں وسعت آتی چلی گئی۔ مرکزی حکومت کی سطح پر مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی نہ ہونے کے باعث ایسے امور کا ایک سلسلہ ہے جن کی زد مسلمانوں کے اسلامی اور ملی تشخص پر پڑتی ہے۔ گذشتہ دنوں میں قانون حق تعلیم، ڈائرکٹ ٹیکسز کوڈ بل، وقف جیسے مسائل سامنے آئے ہیں جن کے مضمرات مسلم اداروں، مدارس اور مساجد کے لیے نہایت خطرناک ہیں۔ بورڈ کے مطالبات کی معقولیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ابھی ضروری ترمیمات کے ذریعہ ان کمیوں اور خامیوں کو دور نہیں کیا گیا ہے۔ بورڈ کو صورت حال کی سنگینی کا پورا احساس ہے۔ چنانچہ ۲۰۱۱ء میں ان مقاصد کے حصول کے لیے جس مہم کا آغاز کیا گیا تھا وہ اب بھی جاری ہے۔

اس پس منظر میں ۲۰-۲۲/اپریل کو ممبئی میں منعقد ہونے والا بورڈ کا بائیسواں آل انڈیا اجلاس خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ بہت سے لوگوں کو اب بھی یہ بات یاد ہوگی کہ ۱۹۷۲ء کا تاریخی اجلاس جس سے بورڈ کی تاسیس کی راہ ہموار ہوئی تھی ممبئی ہی میں منعقد ہوا تھا۔ ممبئی کے مسلمانوں کی ملی مسائل سے وابستگی کی ایک طویل تاریخ ہے، حسب توقع یہ اجلاس پوری طرح کامیاب رہا۔ ممبئی کے مسلمانوں نے پورے جوش اور جذبہ سے اس میں حصہ لیا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے آئینی حقوق کے حصول کی جد وجہد میں ایک روشن باب کا اضافہ کیا۔ عمومی اجلاس کے لیے آزاد میدان کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن وہ اپنی تمام تر وسعت کے باوجود مسلمانان ممبئی کے امنڈتے ہوئے سیلاب کے سامنے تنگ دامانی کا شکوہ کرتا نظر آیا۔ اس اجلاس میں ملت کو درپیش مسائل سے متعلق نہایت اہم تجاویز پاس کی گئیں۔ ان تجاویز کو بروئے کار لانے کے مقصد سے ''آئینی حقوق بچاؤ'' مہم کو جاری رکھنے اور اس میں مزید تیزی لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ عموماً دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ حکومتیں دلیل کی زبان ذرا مشکل سے سمجھتی ہیں لیکن طاقت کی زبان ان کی سمجھ میں زیادہ آسانی سے آجاتی ہے۔ ان دونوں کا مناسب امتزاج ہی دراصل کامیابی کی کلید ہے۔ بورڈ کے مطالبات کی معقولیت تو اظہر من الشمس ہے اور گفتگو کی میز پر

حکومت بھی اسے تسلیم کرتی ہے۔ ممبئی کے مسلمان حکومت کو یہ پیغام بھیجنے میں کامیاب رہے ہیں کہ ان مطالبات کے پیچھے ہندوستانی مسلمانوں کی متحدہ طاقت بھی ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ حکومت ان مطالبات کی معقولیت تسلیم کرتے ہوئے ''قانون حق تعلیم''ڈائرکٹ ٹیکسز کوڈ بل، نکاح رجسٹریشن وغیرہ جیسے امور میں بورڈ کی تجاویز کی روشنی میں ضروری ترمیمات کرے گی اور اس طرح ان مسائل کے حل کی مناسب راہ نکل آئے گی۔ بورڈ نے بجاطور پر یوپی کے جواں سال چیف منسٹر جناب اکھلیش یادو کی ستائش کی ہے جنہوں نے زرعی اراضی کے قانون میں بورڈ کے مطالبہ کے مطابق ترمیم کا وعدہ کیا ہے تاکہ وراثت میں لڑکیوں کو بھی ان کا حصہ مل سکے جس کی شریعت کے مطابق وہ حقدار ہیں۔ یہ ایک بڑی کامیابی ہوگی جو مسلم پرسنل لا بورڈ کی کوششوں کے نتیجہ میں حاصل ہوگی۔ ہمیں یقین ہے کہ مخلص، بیدار اور فعال قیادت کی رہنمائی میں بورڈ اپنے دوسرے مطالبات کو تسلیم کرانے میں کامیاب ہوگا۔

چندسال پہلے کویت سے یہ خبر آئی تھی کہ وہاں کے غیرملکی اسکولوں میں ''الفرقان الحق'' نام کی ایک کتاب تقسیم کی جارہی تھی۔ یہ کتاب ۱۹۹۹ میں امریکہ سے شائع ہوئی تھی اور خاص طور سے امت عربیہ اور عام طور سے عالم اسلام اس کے مخاطب تھے۔ متوسط سائز کے ۳۶۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ اس کے مرتبین نے اپنا نام الصفی اور المہدی لکھا ہے۔ خاتمہ کے علاوہ اس میں ۷۷ چھوٹے بڑے ابواب ہیں جن کو نام نہاد سورتوں کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دراصل شیطانی آیات کا ناپاک مجموعہ ہے اور اس کے برخود غلط مولفین کے بقول نعوذ باللہ قرآن کریم کے اس چیلنج کا جواب ہے جس کی جرأت گذشتہ چودہ صدیوں سے زیادہ عرصہ میں بڑے بڑے فصحائے عرب بھی نہ کرسکے۔ بنیادی طور پر یہ عیسائی عقائد کا مجموعہ ہے اور اس کے بارے میں اس کے مرتبین کا خیال خام یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں عیسائی عقائد اور نظریات جاگزیں کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور ان کو اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔ وہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ وہ اب بھی مسلمان ہیں۔ یہ ایسی بھونڈی کوشش تھی کہ عام طور پر اس کا نوٹس نہیں لیا گیا لیکن اس سلسلہ میں بڑی تشویش کا پہلو یہ ہے کہ چند دنوں پہلے کویت ہی کے تعلق سے بعض اخبارات میں یہ خبر پھر آئی ہے کہ وہاں اسکول کے بچوں کے درمیان یہ شیطانی کتاب فروخت کی جارہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طویل عرصہ میں کسی نہ کسی سطح پر یہ کوشش جاری رہی ہے گو یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ ان کوششوں کا نتیجہ کیا رہا اور نہ یہ معلوم کرنے کا کوئی قرینہ ہے کہ خاص طور سے کویت ہی میں ان کا ارتکاز کیوں ہے۔ پہلے بھی اور اب بھی ان مذموم کوششوں کا نشانہ بچے ہیں جن کے نیم پختہ ذہن کو زیادہ آسانی سے متاثر کیا جاسکتا ہے، قرآن مجید سے مسلمانوں کا تعلق کمزور کرنے اور اس کے بارے میں ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی آرزو عیسائی مشنری اور مستشرقین صدیوں سے اپنے دل و دماغ میں پالتے رہے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کرتے رہے ہیں۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ کتاب الٰہی سے مسلمانوں

کا رشتہ کمزور ہو جائے تو پھر ان کا وجود ختم کر دینا مشکل نہ ہوگا۔ وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ جس تہذیب کو دنیا میں رائج کرنا چاہتے ہیں اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی کتاب ہے۔ اس شیطانی کوشش کے سلسلہ میں دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ یہ چند افراد کی انفرادی کاوش کا نتیجہ ہے کچھ سادہ لوح شاید یہ بات باور کرلیں لیکن جن لوگوں کو اسلام کے خلاف جاری مغربی یورش کا کسی حد تک ادراک ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ اور اس طرح کی دوسری کوششیں ایک منظم اور مربوط سازش کا نتیجہ ہیں اور اس کے مظاہر مختلف جگہوں پر ایک منصوبہ کے تحت مختلف شکلوں میں ظاہر ہورہے ہیں۔ فروری میں بگرام میں امریکی سپاہیوں کے ہاتھوں قرآن مجید کو جلانے کا دلخراش واقعہ پیش آیا۔ اپریل میں فلوریڈا کے بدنام زمانہ پادری ٹیری جونز نے علی الاعلان پولس کی بھاری نفری کی موجودگی میں قرآن کریم کو جلانے کی مذموم حرکت کی۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کی دلآزاری، اخلاقی اور مسلمہ انسانی اصولوں کی پامالی کے اس گھناؤنے جرم سے انسانی حقوق کے نام نہاد ٹھیکہ داروں نے نہ تو اسے روکا اور نہ اسے کوئی سزا دی گئی۔ اور ابھی چند دنوں پہلے امریکہ میں اعلیٰ فوجی افسروں کے ایک ٹریننگ کورس کی تفصیلات سامنے آئیں تو پورا عالم اسلام انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس کورس میں امریکہ کے فوجی افسروں کو یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ امریکہ کے دشمن شدت پسند نہیں بلکہ خود اسلام ہے جو شدت پسندی کا سرچشمہ ہے۔ اس فلسفہ حیات کو اب مزید برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کو بدلنا ہوگا ورنہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹادینے کی ضرورت ہے۔ اسلام کے خلاف اب آخری اور حتمی جنگ کا وقت آگیا ہے۔ مکہ اور مدینہ پرناگاساکی اور ہیروشیما جیسے حملے کیے جاسکتے ہیں وغیرہ۔ اس قسم کی تعلیم امریکی سیکوریٹی اداروں میں عام ہے۔ اس سے پہلے بھی بار بار اس نوع کی چیزیں سامنے آچکی ہیں۔ اس رپورٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد پنٹاگان نے سخت لفظوں میں اس کی مذمت کی ہے اور اسے امریکی اقدار کے منافی قرار دیا ہے۔ لیکن کئی دن گذرنے کے باوجود وہائٹ ہاؤس نے اس سلسلہ میں کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ اور نہ ہی کسی مسلم ملک نے ابھی تک اس سلسلہ میں کوئی ردعمل ظاہر کیا ہے۔ یہ تسلیم کرلینا کہ یہ کورس اور اس نوع کی دوسری چیزیں جن کی تفصیلات اب دستیاب ہیں وزارت دفاع کے علم اور مرضی کے بغیر سیکوریٹی اداروں میں جاری اور نافذ تھیں سادہ لوحی کی انتہا ہوگی۔ دراصل وہ صلیبی جنگ جس کا آغاز صدر بش نے اپنے عہد صدارت میں کیا تھا پوری شدت سے جاری ہے۔ صدر اوبامہ کے عہد میں اس میں نہ کوئی کمی آئی اور نہ کسی طرح کی نرمی۔ عہدہ صدارت سنبھالنے کے بعد اوبامہ نے العربیہ کے انٹرویو اور انقرہ اور قاہرہ کی تقریروں میں عالم اسلام کے ساتھ تعلقات میں باہمی احترام پر مبنی جس نئے عہد کے طلوع کی نوید دی تھی اس کی حیثیت سراب سے زیادہ نہ تھی۔ عالم اسلام پر تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوا البتہ ان کو نوبل انعام امن ضرور مل گیا۔ کہنے کو تو بار بار یہی کہا جارہا ہے کہ امریکہ کی جنگ اسلام کے خلاف نہیں ہے بلکہ شدت پسندی کے خلاف ہے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ جنگ دراصل اسلام کے خلاف ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیا عالم اسلام کوئی منصوبہ بندی کررہا ہے۔

مقالات

بابا محمد عثمان کشمیری

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ایک شاگرد کے حالات و تصنیفات

ڈاکٹر عارف نوشاہی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ/۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کے ایک کشمیری شاگرد بابا محمد عثمان کے حالات برصغیر میں چودھویں صدی ہجری کے بالکل اوائل/انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں لکھے جانے والے علماء کے تذکروں میں مل جاتے ہیں۔ان تمام تذکروں میں مشترکہ بات متعلقہ حالات کا اختصار اور یکسانیت ہے۔جن تذکروں میں بابا محمد عثمان کشمیری کے مختصر حالات درج ہوئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں: مولوی فقیر محمد جہلمی (۱۲۶۰؟-۱۳۳۴ھ/۱۸۴۴-۱۹۱۶ء) کا حدایق الحنفیہ (تکمیل ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء، اضافہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء)، مولوی رحمان علی (۱۲۴۴-۱۳۲۵ھ/۱۸۲۸-۱۹۰۷ء) کا تذکرۂ علمائے ہند (تصنیف ۱۳۰۵-۱۳۰۷ھ/۱۸۸۷-۱۸۹۰ء) اور ابو محمد مسکین حاجی محی الدین مسکین کبروی سرہندی کشمیری (پ ۱۲۸۲ھ/۶۶-۱۸۶۵ء) کا تحایف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار (تصنیف ۱۳۱۰ھ/۹۳-۱۸۹۲ء)۔

مولوی فقیر محمد جہلمی کے بقول ''بابا محمد عثمان بن شیخ محمد فاروق بن شیخ محمد حسنی (کذا: چشتی) عالم، فاضل، فقیہ، محدث تھے۔علوم مولانا سعد الدین صادق و مولانا حاجی محمد واخوند مقیم السنہ (کذا) سے حاصل کیے۔پھر وطن چھوڑ کر دہلی میں شاہ ولی اللہ محدث کی خدمت میں پہنچے اور ان سے علم حدیث و کتب شریعت کی اجازت حاصل کی اور علم طریقت کو اخذ کیا۔جن دنوں ہندوستان میں فتنہ و فساد حائل تھا (۱)، آپ اپنے وطن میں آ گئے اور خواجہ عبد الرحیم پنج کمانی (کذا: شیخ کمانی) سے بھی بہت کچھ فیض حاصل کیا''۔(۲)

اسلام آباد۔

مولوی رحمان علی کو بابا محمد عثمان کے مفصل حالات نہیں ملے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر ''تکملۃ الکتاب'' میں محض چند الفاظ میں یوں کیا ہے:

''بابا محمد عثمان کشمیری ابن شیخ محمد فاروق، ملا سعدالدین صادق وغیرہ علمائے کشمیر کے شاگرد تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی خدمت میں بھی پہنچے اور حدیث وفقہ کی اجازت حاصل کی''۔ (۳)

حاجی محی الدین مسکین کشمیری نے بابا محمد عثمان کے ہم وطن ہونے کے باوجود ان کے بارے میں کوئی خاص معلومات بہم نہیں پہنچائیں۔ ان کا سال وفات تک نہیں لکھا، جس کا اہتمام وہ دوسرے رجال کے بارے میں اکثر وبیشتر اپنی کتاب میں کیا کرتے ہیں۔ ان کا بیان یہ ہے:

''شیخ عثمان رادھو، شاہ محمد فاروق بن شیخ محمد چشتی کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے مولانا سعد الدین صادق، اخوند ملا سلیمان، ملا محمد مقیم اور ملا حاجی محمد سے علوم عقلی اور نقلی میں استفادہ کیا اور دہلی شہر میں ختم المحدثین شاہ ولی اللہ دہلوی سے حدیث کی اجازت کا شرف حاصل کیا اور باطنی علم میں بھی فیض یاب ہوکر واپس وطن لوٹے۔ یہاں (کشمیر میں) حضرت خواجہ عبدالرحیم نقشبندی المعروف خواجہ شیخ کمان کے مرید ہوئے اور ان سے تعلیمات پاکر خود بھی معرفت کا چراغ روشن کیا۔ بابا محمد عثمان جودت طبع اور حسن تقریر میں یکتا اور بے نظیر تھے۔ جب وفات پائی تو اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے''۔ (۴)

حاجی محی الدین کشمیری نے بابا محمد عثمان کے ایک مرید رحمہ شاہ (م: ۱۵ ربیع الآخر ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ء) کا تذکرہ بھی کیا ہے جو موضع ترچھل پرگنہ چہراٹ میں رہتے تھے۔ (۵)

بابا محمد عثمان کشمیری کے بارے میں دوسرے تذکروں سے دست یاب اطلاعات بس اسی حد تک ہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ان کے حالات پر مبنی ایک خودنوشت تحریر پیش کریں جو دراصل ہمارے اس مقالے کی بنیاد ہے، ہم چاہیں گے کہ ان کے آبا واجداد اور علمی و روحانی اساتذہ (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے علاوہ) کا مختصر تعارف بھی درج کردیں۔

شیخ محمد چشتی (جد): بابا محمد عثمان کے جد شیخ محمد چشتی المعروف رادھو، محلّہ باغ یوسف

شاہ (سری نگر؟) میں سکونت رکھتے تھے۔ان کا تعلق حضرت خواجہ طاہر رفیق اشائی (۶) (م: غرہ ذی الحجہ ۱۰۰۱ھ) بن خواجہ ابراہیم اشائی کے قبیلہ سے تھا۔مولوی حیدر چرخی (۷) (م: ۲۲/صفر ۱۰۵۷ھ) سے عقلی اور نقلی علوم حاصل کیے اور کچھ عرصہ پیشہ تدریس سے منسلک رہے۔پھر شیخ محمد علی چشتی کی خدمت میں پہنچ کر طریقۂ چشتیہ کی تعلیم و تربیت حاصل کی۔وہ ہمیشہ حضرات چشتیہ کے طریقہ کے مطابق ذکر جہر کرتے تھے۔ان کے متعدد خلفا ہوے، جیسے بارہ مولہ میں شیخ محمد چشتی بن شیخ جلال چشتی اور محلّہ باغبان پورہ میں شیخ عبدالکریم۔شیخ محمد چشتی رادھو شاعرانہ مذاق بھی رکھتے تھے، کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک سال میں ایک لاکھ اشعار کہے، وہ اپنے زمانے میں (حضرت بل میں) آنحضرتؐ سے منسوب موئے مبارک کی زیارت کروانے پر مامور تھے۔۱۶/شوال ۱۱۲۶ھ/ ۱۶/اکتوبر ۱۷۱۴ء کو انتقال ہوا اور اپنے مکان کے پاس ہی دفن ہوے۔(۸) انہوں نے شیخ نظام الدین تھانیسری کی کسی عبارت (یا رسالہ) کی شرح بھی لکھی تھی۔اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ان کے چار بیٹے شیخ علی، شیخ صدیق، شیخ عابد اور شیخ فاروق تھے. چاروں اپنے والد کے مرید تھے اور فضل و کمال میں ممتاز تھے۔چاروں وفات کے بعد اپنے والد کے جوار میں دفن ہوئے۔(۹)

مولانا سعدالدین صادق (استاد): مولانا سعدالدین صادق اپنے والد مولانا امان اللہ کشمیری دہلوی کے شاگرد تھے۔مولانا امان اللہ ہنگامۂ نادری میں ۱۵/ذیقعدہ ۱۱۵۲ھ کو بمقام پانی پت شہید ہوے تھے۔(۱۰) مولانا سعدالدین ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء میں پیدا ہوئے۔مباحثہ اور مناظرہ کرنے میں بے مثال تھے۔پیشہ تعلیم و تدریس تھا، لیکن تصوف کے حقایق و معارف سے بھی بہرہ ور تھے۔ان کے والد نے انہیں کشمیر سے دہلی بلالیا تھا۔وہیں اپنے والد کی شہادت کے کوئی ۳۵ دن بعد ۲۳/ذی الحجہ ۱۱۵۲ھ/۱۷۴۰ء کو رحلت فرما کر اپنے والد کے جوار میں دفن ہوے۔(۱۱) ان کے بیٹے مولوی قوام الدین (م: ۱۵/ذیقعدہ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۵ء) بھی عالم دین اور کشمیر کے شیخ الاسلام تھے۔شیخ عبدالرحیم نقشبندی کے مرید تھے اور چوبیس سال تک ان کی خدمت میں رہے اور ان کے حالات و کمالات میں رسالۂ قوامیہ تصنیف کیا۔(۱۲)

اخوند ملا سلیمان (استاد): مولانا خواجہ ابوالفتح کلو (۱۳) (م: ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء) کے بیٹے تھے۔ تقریباً ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۴ء میں پیدا ہوئے۔پہلے اپنے والد کے ایک شاگرد ملا عنایت اللہ شال (۱۴)

(م: شعبان ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء) اور بعد میں مولانا عبدالشکور بلخی سے اکتساب علوم کیا۔ علم اسطرلاب، ریاضی اور حساب میں امتیاز حاصل کیا۔ نواب عنایت اللہ خان صوبہ دار کشمیر کے زمانے میں انہیں صدر مدرس بنایا گیا۔ وہ فجر سے نماز عشاء تک مسلسل تدریس کرتے۔ سرکار کی طرف سے جاگیر ملی ہوئی تھی، اسی پر قناعت کر کے فراغت خاطر کے ساتھ شریعت اور طریقت کی بجا آوری میں منہمک رہے۔ ۳/ ربیع الاول ۱۱۶۲ھ/۱۰/ فروری ۱۷۴۹ء کو وفات پا کر جامع مسجد کلاں (سری نگر) کے قریب اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔(۱۵)

خواجہ عبدالرحیم نقشبندی (شیخ طریقت): خواجہ عبدالرحیم ملقب بہ خواجہ شیخ کمان، ابن خواجہ محمد شریف بن خواجہ محمد اشرف بن خواجہ محمد اتا تاشقندی۔ ان کے آبا و اجداد کے پاس حکومت تاشقند تھی۔ چوبیس سال کی عمر میں اپنے بھائی خواجہ شاہ نیاز نقشبندی کے ساتھ وطن سے نکلے اور پنجاب میں اپنے قرابت دار نواب عبدالصمد خان سیف الدولہ کے ہاں قیام کیا۔ وہاں سے دہلی پہنچے اور محمد شاہ غازی نے انہیں ''شیخ کمانی'' کا خطاب دیا۔ جب جذبۂ باطنی غالب ہوا تو بادشاہ کی مصاحبت چھوڑ کر شیخ محمد عابد سنامی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آداب طریقت سیکھے۔ دہلی میں دونوں بھائی خواجہ موسیٰ خان دہ بیدی سے مستفید ہوئے اور اجازت وخلعت پا کر شیخ کے ہم رکاب خراسان چلے گئے۔ خراسان سے واپسی پر میرزا خان حاکم پنجاب کے زمانے میں ایمن آباد کے فوجدار مقرر ہوئے۔ سکھوں اور احمد شاہ درانی کی لڑائی میں ان کے بھائی خواجہ شاہ نیاز شہید ہو گئے تو یہ جموں چلے گئے اور وہاں سے اپنے شیخ طریقت خواجہ موسیٰ خان دہ بیدی سے دوبارہ ملنے ترکستان گئے۔ مرشد نے انہیں کشمیر میں رہنے کا حکم دیا۔ چنانچہ یہاں جاگیر خریدی اور خلق خدا کی راہ نمائی کرتے رہے۔ متعدد علما و مشائخ ان کے مریدوں میں شامل تھے۔ شیخ الاسلام ملا قوام الدین نے رسالۂ قوامیہ (فارسی) اور شیخ شرف الدین زہگیر نے رسالہ روضۃ الشرف (فارسی) ان کے حالات و مناقب میں تصنیف کیا ہے۔ ۱۲/ جمادی الاول ۱۲۰۰ھ/۱۳/ مارچ ۱۷۸۶ء کو ۱۰۱ سال عمر پا کر کشمیر ہی میں فوت ہوئے۔(۱۶)

بابا محمد عثمان کشمیری کے خودنوشت حالات: خوش قسمتی سے ہمیں بابا محمد عثمان کشمیری کی چند فارسی تصانیف قلمی صورت میں نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد میں ملی ہیں۔ ان میں

سے ایک تصنیف کے دیباچے میں انہوں نے اپنے کچھ حالات بھی تحریر کیے ہیں ۔ یہ تحریر اور ان کی چند تصانیف کی دستیابی ہی دراصل ہمارے اس مضمون کا محرک ہے ۔ یہاں پہلے ہم ان کے خودنوشت حالات لکھیں گے، بعد میں ان کی دستیاب تصانیف کا ایک مجمل تعارف پیش کریں گے ۔ افسوس کہ مجھے بابا محمد عثمان کشمیری کا نہ تو سال پیدائش اور نہ ہی سال وفات معلوم ہو سکا ہے ۔ صرف یہ معلوم ہے کہ وہ ۱۱۸۶ھ/۷۲-۱۷۷۲ء میں زندہ تھے ۔ انہوں نے فارسی رسالہ مسئلہ حیات انبیاء کے دیباچے میں اپنے حالات تحریر کیے ہیں ۔ یہاں اس کا اردو ترجمہ، جو راقم السطور نے کیا ہے ۔ پیش خدمت ہے:

''خاکسار بابا محمد عثمان بن بابا محمد فاروق بن شیخ محمد چشتی المعروف شیخ بابا - کان اللّٰہ لھم فی الدنیا و العقبی - نے چار سال کی عمر میں قرآن حفظ کرنا شروع کیا اور دس سال کی عمر میں اس سے فراغت پاکر فارسی کی قدیم وجدید نظم ونثر (اور) تاریخ کی کتابیں پڑھنا شروع کیں اور بارہ سال کی عمر میں متداول رسائل پڑھ لیے ۔ اس کے بعد اپنی استعداد کے مطابق نظم ونثر اور غزل ومثنوی پر مشتمل تصنیفات کا مطالعہ کیا اور عربی علوم کا درس لینے لگا ۔ اس دیار (کشمیر) میں علوم معقول ومنقول کی جن جن کتابوں کا رواج تھا وہ اکابر وقت کی خدمت میں رہ کر تھوڑے ہی عرصے میں پڑھ ڈالیں اور سترہ سال کی عمر میں اساتذہ کی اجازت سے تدریس میں مشغول ہو گیا ۔ کم وبیش دو تین سال اسی طرح گزر گئے ۔ اسی اثنا میں والد صاحب رحلت فرما گئے اور میرے حالات پریشان ہو گئے ۔ چوبیس سال کی عمر میں ہندوستان جاکر سیال کوٹ اور لاہور کے اولیاء اور فضلاء سے ملاقات کرتا ہوا دہلی جا پہنچا ۔ وہاں مجھے نواب روشن الدولہ کے قدیم مدرسہ میں تدریس سونپ دی گئی ۔ اکابر امراء میں سے ایک امیر کے ساتھ دوستی بھی ہو گئی اور یوں ان دو ذرائع سے میری روزی کا خود بخود بندوبست ہو گیا ۔ یہاں مجھے قاضی مبارک (۱۷)، ملا احمد اللہ (۱۸) اور پورب کے دیگر علماء کی صحبت نصیب ہوئی، جن سے حواشی میر زاہد ہروی (۱۹)، سلم (۲۰) اور مسلم (۲۱) پڑھنے کا موقع ملا ۔ اسی دوران متعدد اولیاء کے دیدار کی سعادت بھی حاصل ہوتی رہی ۔ کتب (صحاح) ستہ کی اجازت شیخ عبداللہ سالم بصری کے شاگرد حاجی محمد افضل لاہوری (۲۲) اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پوتوں (۲۳) سے پائی ۔ چودہ سال تک شیخ دہلی شاہ ولی اللہ

محدث نقشبندی عمری کی خدمت میں آنا جانا رہا۔صحاح ستہ کا بیشتر حصہ، مسند امام احمد، موطائے امام مالک، آثار امام محمد، موطائے امام محمد، حجۃ اللہ البالغہ کا کچھ حصہ، فصوص الحکم کا بیشتر حصہ، فتوحات المکیہ کا کچھ حصہ، عوارف المعارف کا نصف، قصیدۂ فارضیہ، الٰہیات شفا، لمعات، تاویل الاحادیث، عقد الجید، الانصاف، قول جمیل اور ہمعات (۲۴) ان کی خدمت میں پڑھیں۔ کلام مجید کا آخری نصف ان سے سنا اور طرق حدیث، قاعدۂ تحدیث اور احکام کی روایت اور استنباط کرنا ان سے سیکھا اور تمام مرویات کی اجازت پائی اور طریقۂ نقشبندیہ میں داخل ہوکر اشغال حاصل کیے۔جب نسبت نقشبندیہ سے کچھ آشنائی ہوچکی تو قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کے اشغال بھی سیکھے۔کیا کیا فائدے تھے جو مجھے حاصل نہ ہوے۔الحمدللہ علی ذلک۔

اڑتیس سال کی عمر میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدمت سے رخصت ہوکر اپنے وطن (کشمیر) پہنچا۔ان دنوں وہاں ایک غاصب سکھ جیون (۲۵) کا تسلط تھا، میں (ایسے شخص سے) چند ہزار دام پر مشتمل اپنی چغتائی مدد معاش واگذار کروانے کی بجاے ایک گوشۂ گمنامی میں اوراد و وظایف اور معقول و منقول کی تدریس میں مشغول ہوگیا۔کم و بیش تین سال اسی غربت اور پریشانی میں گزر گئے اور علاقے کے ایک بھی غبی غنی سے- خدا انہیں برباد کرے- کچھ التفات اور مراعات نہ پائی۔تا آں کہ بادشاہ اسلام...... (ترجمے میں القاب اور مدحیہ اشعار حذف کردیئے گئے ہیں) احمد شاہ غازی نے پنجاب پر حملہ کیا (۲۶) اور سردار نورالدین خان کو کشمیر فتح کرنے کے لیے بھیجا۔غیبی کمک سے کشمیر جنت نظیر ان کے ہاتھوں فتح ہوا اور ان کے تصرف میں آگیا۔اس کے ساتھ ہی نواب منعم الدولہ سدوزئی کشمیر کا صوبہ دار بن کر یہاں آیا اور عدل و احسان قایم کیا اور فقراء و علماء کی قدردانی ہونے لگی۔نواب نے اس خاکسار کو بھی طلب فرمایا اور مہربانی کی اور سکھ جیون کے زمانۂ تسلط میں میری ضبط شدہ چند ہزار دام کی چغتائی مدد معاش بحال کی۔اس سے میری کچھ پریشانی دور ہوئی اور فراغت نصیب ہوئی تو حواشی میر زاہد پر تعلیقات، سلم کی مختصر شرح اور تصوف و حدیث پر مختصر رسائل تصنیف کیے۔نواب منعم الدولہ کی فرمایش پر میں نے زبدۃ الآثار کا (فارسی) ترجمہ اور فتوحات (مکیہ) کا مختصر (فارسی) ترجمہ سفر سادس تک کیا۔دو سال کے بعد جب نواب منعم الدولہ واپس چلے گئے تو فقراء کے دشمنوں

نے - جو ہمیشہ سے اس جماعت کی عداوت میں آگے آگے رہے ہیں - میری واگذار شدہ مدد معاش دوبارہ ضبط کر لی اور مجھ سے مبلغ سو روپیہ بطور جرمانہ لیے گئے ۔ دوبارہ پریشان حالی عود کر آئی اور مجھے گوشۂ گمنامی میں جانا پڑا۔ تا آں کہ اب ۱۱۸۰ھ (۶۷-۱۷۶۶ء) میں بعض طالب علموں کی تحریک پر نواب مصلح الدولہ نے اس خاکسار کو طلب کیا ہے۔'' (۲۷)

تصنیفات: بابا محمد عثمان نے مذکورہ بالا خود نوشت میں اپنی جن تصنیفات کا ذکر کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ تعلیقات بر حواشی میر زاہد ہروی۔

۲۔ مختصر شرح سلم۔

۳۔ ترجمۂ زبدۃ الآثار۔

۴۔ مختصر ترجمۂ فتوحات المکیہ (تا سفر سادس)۔

۵۔ تصوف و حدیث پر مختصر رسائل جن کا نام نہیں لیا گیا۔ انھوں نے آئینۂ قدرت کے دیباچے میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض بزرگوں کی درخواست پر انھوں نے صوفیہ کے مشکل کلمات کی شرحیں لکھی ہیں، لیکن نام یہاں بھی نہیں بتایا۔

اس کے علاوہ ان کی دو اور تصانیف بھی ہیں:

۶۔ مکتوبات۔

۷۔ رسالہ در مسئلہ حیات انبیاء۔

بابا محمد عثمان کشمیری شعر گوئی کا مذاق بھی رکھتے تھے اور ان کا فارسی نمونۂ کلام دستیاب ہے۔ مندرجہ بالا فہرست میں سے ہمیں فی الحال بابا محمد عثمان کشمیری کی تین تصانیف دستیاب ہوئی ہیں ۔ ایک اور کتاب کشف المعانی جو ان کی تصنیف تو نہیں ہے لیکن شاید اس کا کوئی تعلق ان سے ہو، وہ بھی دستیاب ہے۔ اتفاق سے یہ سب کتابیں ایک ہی جگہ یعنی نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد میں موجود ہیں اور مجھے جون ۲۰۰۳ء میں وہاں دیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس کے لیے میں آرکائیوز کے منتظمین کا شکر گزار ہوں ۔ آرکائیوز کے ذخیرۂ مفتی فضل عظیم بھیروی میں شمارہ: اسلام/۶۴۶ کے تحت ایک ناقص الطرفین قلمی بیاض محفوظ ہے۔ اس

بیاض کے کاتب یا قدیم مالک نے اس کے جو ورق شمار لگائے تھے اس کے مطابق اب صرف اوراق ۳۰ تا ۴۴ اور ۷۹ تا ۹۳ باقی بچے ہیں۔ انہی اوراق میں بابا محمد عثمان کی دو نامکمل تصانیف اور ایک مکمل تصنیف نقل ہوئی ہے۔

مکتوبات (نامکمل): مکتوبات اس بیاض میں اوراق ۳۰ تا ۴۴؛ ۸۲تا۸۶؛ ۸۹تا۹۳ نقل ہوئے ہیں۔ یہ عربی اور فارسی میں ہیں۔ عربی خطوط اپنے استاد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نام ہیں (۲۸) جب کہ فارسی خطوط مختلف افراد کے نام ہیں۔ ان تمام افراد کی شناخت اس لیے بھی مشکل ہے کہ مکتوب نگار نے بعض افراد کو نام کی بجائے ان کے لقب سے یاد کیا ہے اور بعض مکتوب الیہم کے نام اور لقب بھی نہیں لکھے۔ ان میں سے چند خطوط کے مضامین کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ خلیفۂ اعظم کے نام، اس میں لکھتے ہیں کہ میں نے سن رکھا تھا کہ (میرے) جد بزرگوار (شیخ محمد چشتی) چند روز حافظ شیرازی کا یہ شعر مسلسل پڑھتے رہے:

چرا چون لاله خونین دل نباشم؟ کہ با من نرگس او سرگران است

اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اس کی شرح لکھتے رہے۔ جب اس شعر پر تامل کیا تو مفہوم واضح ہو گیا جو محض فیض غیبی تھا اور وہ یہ کہ نرگس آنکھ کی طرف اشارہ ہے اور آنکھ بمعنی عین ہے اور ''عین'' سے مراد ذات ہے۔ ''سرگرانی نرگس'' اصحاب ذات بہ حجب صفات کی طرف کنایہ ہے۔ خاکسار نے بھی اسی فیض غیبی سے ایک شعر کہا، بعد میں اس پر کچھ اور اشعار کا اضافہ کیا جو آپ کو سنانا چاہتا ہوں:

بسان صید در دام اضطراب طرفه ای دارم برنگ موی آتش دیده تاب طرفه ای دارم
بدان چون اہل ساحل با امید از بحر غرقابم کہ من از چشمہ سار وحدت آب طرفه ای دارم
بحمد اللہ کہ ظلمت دور شد از شستہ صافی ام بدل از صورت او آفتاب طرفه ای دارم
۰۰۰ (۲۹) ہرگز نمی یابی کمال دانش ای بیخود کہ من از جوہر خود پیچ و تاب طرفه ای دارم

اس مکتوب سے ہمیں یہ پتا بھی چلتا ہے کہ بابا محمد عثمان کا تخلص ''بے خود'' تھا۔

۲۔ مکتوب الیہ نامعلوم، اس خط میں مرزا محمد سلام کو پڑھنے کی تاکید کی ہے۔

۳-نواب عباداللہ خان کے نام۔

۴-نواب نصرت جنگ کے نام۔

۵-مکتوب الیہ نامعلوم جو غالباً کشمیر میں تھا۔مکتوب نگار سفر قنوج کے بعد دہلی لوٹے اور یہ خط لکھا ''اما از ابتدای ورود دہلی تا امروز ہزاران عریضۂ نیاز مرسل گردید، لیکن مجرد چیز رسیدی نرسید تا بہ جواب چہ رسد''۔ اور ''عرضی کہ در خدمت فلانہ فرستادہ بودند، فقیر آن را از نظر عالی گذرانیدہ، ذکر کمی جاگیر بسیار کردہ شد۔ خدا کند کہ آبرویی بہ ظہور انجامد۔ مبلغ یک ہزار و سیصد روپیہ بابت زر جاگیر ارسال داشتہ اند''۔

۶-خلیفہ صاحب کے نام۔

۷-فاضل بابا کے نام۔

۸-مخدوم صاحب کے نام؛ لیلۃ القدر کے بارے میں لکھا ہے کہ کس رات اور کس گھڑی میں واقع ہوتی ہے۔ ''ارشاد عالی درجات خود مدظلہ دیدہ ام کہ در سالی این خاکسار ہمراہ خدام کرام ایشان در مسجد ایشان معتکف بود، بیست و یکم ماہ مبارک رمضان از حجرۂ خاص بیرون آمدند و یاران را بشارت لیلۃ القدر دادند و بعد چند سال دیگر باز در بندگی ایشان حاضر بودم کہ بیست و ہفتم (رمضان) از معتکف خود جلوہ فرما شدہ فرمودند کہ بہ دعا و صلوۃ متوجہ باشید کہ اینست لیلۃ القدر ھذا ما نقلت من خط بعض خلفای جدی علیہ الرحمہ والعھدۃ علی الراوی۔ و از جد بزرگوار علیہ الرحمۃ منقول است کہ شب ششم رجب شب قدر مشاہدہ کردند و اشجار را دیدند کہ در سجدہ منحنی گردیدند۔ ایشان مشغول تحریر بودند، قلم از دست ایشان بی اختیار جدا شدہ افتاد''۔

۹-اپنے والد کے ایک خلیفہ کے نام، عربی میں۔

۱۰-نواب صاحب کے نام۔

۱۱-مرشد (حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی) کے نام، یہ غالباً کشمیر سے لکھا گیا ہے اور وہاں کے حالات اور اپنی مایوسیوں پر ایک تبصرہ کیا ہے۔ انہی دنوں حضرت شاہ ولی اللہ محدث کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۱۵۹-۱۲۳۹ھ/۱۷۴۶-۱۸۲۴ء) کی شادی ہوئی تھی، اس کی مبارک باد بھی لکھی ہے۔ ''خرابی احوال درین کفرستان کرای نوشتن نکند۔ زندگانی بہ آخر رسید۔

روی آرزوی روحانی در آینۂ خیال ندید ۔ ہر چند در ذکر وفکر لذتی ہویداست اما غیب مسموعہ ناپیداست در اسباب نیکی معاش اگر چہ فراخی است اما دندان برجگر افشردہ سعی کارھای دنیوی در تراخی است خاکسار وضع خود برنمی گرداند ۔ در ماہ یک مرتبہ از کُنج مسجد بہ جہت حفظ جان برمی آید و ملاقاتش می نماید ۔ انصرام امر خیر عبدالعزیز صاحب شنیدہ، بہ عرض مبارک باد''۔

۱۲- کسی دوست کے نام۔

۱۳- ملا محمد وفا کے نام، اس خط میں مولوی حسام الدین اور کتاب کارنامۂ تیمور کے نسخے کا ذکر ہوا ہے جس میں کتابت کی اغلاط تھیں اور مکتوب نگار نے اسی مناسبت سے فارسی کی یہ ضرب المثل نقل کی ہے ''غلط کتاب، اعجاز کتاب است''، یعنی کتاب کی غلطی کاتبوں کا معجزہ ہے۔

۱۴- نواب علی قلی خان کے نام؛ اس خط میں حسن قلی خان کا ذکر بھی ہوا ہے۔

۱۵- ملا محمد مقیم کے نام؛ کسی مولوی صاحب کی رحلت کی تعزیت پر۔ مکتوب الیہ ممکن ہے وہی بزرگ ہوں جو بابا محمد عثمان کے استاد بھی تھے۔

۱۶- شیخ طریقت (حضرت شاہ ولی اللہ) کے نام، عربی میں خط طویل القاب کے ساتھ۔

۱۷- شیخ (شاہ) عبدالعزیز کے نام، یہ خط کشمیر سے لکھا گیا ہے اور بابا صاحب نے دہلی میں اپنے استاد زادوں اور حضرت شاہ ولی اللہ کے دیگر مریدوں اور حاضر باشوں کو یاد کیا ہے اور انہیں سلام بھیجا ہے ، جیسے میاں محمد صاحب ، میاں محمد رفیع الدین صاحب ، میاں عبدالقادر صاحب، صاحبزادۂ عالی تبار (شاید شاہ عبدالغنی)، میاں محمد عاشق (پھلتی؟)، میاں نوراللہ، میاں محمد امین، محمد جواد، فصیح اللہ اور کرم بخش۔

۱۸- ایک خط جو ''مخدوما مکرما'' کے خطاب سے شروع ہوتا ہے (ورق ۹۰ الف)، اس میں امیر خسرو کے معروف شعر:

ز دریای شہادت چون نہنگ لا بر آرد سر
تیمّم فرض گردد نوح را در عین طوفانش

کی شرح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''مرشدِ مرشدِ این عارج معارجِ تقصیر وفروتری حضرت نظام الدین تھانیسری عبارت اول را در نسخہ ای از نسخ خود بتقریب آوردہ و در شرح

آن ذکر کردہ'' اور آگے چل کر لکھتے ہیں'' وجد امجد این فقیر عبارتِ اخیر را شرحی کبیر نوشتہ اند کہ خلاصۂ آن بہ قلم می آید'' اور اس کا خلاصہ لکھا ہے۔

ترجمۂ زبدۃ الآثار منتخب بہجۃ الاسرار موسوم بہ آئینۂ قدرت (نامکمل): اس بیاض کے ورق ۷۹ تا ۸۱ پر اس ترجمے کا صرف دیباچہ نقل ہوا ہے اور متن غائب ہے. تاہم اس دیباچے کی مدد سے اس ترجمے کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔ زبدۃ الآثار شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی عربی کتاب ہے اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات ومناقب پر کتاب بہجۃ الاسرار مؤلفہ نورالدین ابوالحسن علی بن یوسف شافعی المعروف ابن جہضم ہمدانی (م ۷۱۳ھ/۱۳۱۴ء) کی تلخیص ہے۔ بابا محمد عثمان اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:'' در خدمت عارف باللہ، مجدد دورۂ باز پسین، مقرب درگاہ سبحانی حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ السامی مدتی خاک بوسی نمود و آشنا بہ طرق صوفیہ گشت و بہ استدعای بعضی بزرگان اکثر کلمات مشکلۂ این طایفہ را شرح ہا نوشت''۔ پھر احمد شاہ درانی کا دور حکومت (۱۱۶۰ - ۱۱۸۷ھ/ ۱۷۴۷-۱۷۷۳ء) آیا اور نواب منعم الدولہ بلند خان بہادر سدوزئی (صوبہ دار کشمیر) نے ۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء میں خطہ کشمیر کو اپنے ورود مسعود سے گلشن آباد بنا دیا اور اپنے عدل وانصاف سے کشمیر کو کفار کے ظلم سے پاک کیا۔ نواب صاحب سلسلۂ قادریہ سے وابستہ تھے۔ انہوں نے مترجم کو بھی نوازا اور زبدۃ الآثار کو روزمرہ فارسی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ مترجم نے یہ کام شروع کیا اور اس موقع پر یہ نظم لکھی:

آئینہ قادر قدرت نمای یافتم این ترجمۂ جانفزای
نام نہاد آئینۂ قدرتش ہاتف غیبی بنگر صفوتش
قدرشناسان کہ گہر سفتہ اند دُرج درِ معرفتش گفتہ اند
قدرت قادر ہمہ پیدا درو الطف اسرار ہویدا درو
در چمن ہر ورقش کن نظر راز نہانیست چو گل جلوہ گر
نام خدای حمد شد بجا منتخب بہجۃ الاسرار را
آری ہر مصرع گہری چو حرف یابی تاریخ بطرز شگرف

کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے، الٰہی بہ محض موہبت خاص از نعمت خوان عظیم

الشان احسان'' کا نک تراہ'، ما گدایان تہی دست را کہ برخاک مذلت افتادہ ایم۔

رسالہ در مسئلہ حیات انبیاء (مکمل): یہ رسالہ اس بیاض کے ورق ۱۸۶الف تا ۱۸۹الف نقل ہوا ہے۔اس کا سبب تصنیف مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

''۱۱۸۰ھ/۶۷-۱۷۶۶ء میں (کشمیر کے) نواب مصلح الدولہ نے بعض طالب علموں کی تحریک پر اس خاکسار کو طلب کیا اور مناظرہ اور مسئلہ بیان کرنے کے لیے کہا۔ چوں کہ وہ میلاد النبیؐ کے دن تھے، میں نے اس مناسبت سے درود شریف سے متعلق احادیث بیان کیں۔ رفتہ رفتہ بات حدیث ''ما من احد لسلم علی الا رد الله علی روحی'' تک جا پہنچی۔ میں نے حاضرین مجلس سے پوچھا کہ بعض اکابر جو انبیاء کی (بعد از ممات) جسمانی حیات کے قائل نہیں ہیں۔جیسا کہ نسفی اور علاء الدین قونیوی کے کلام سے پتا چلتا ہے اور میرے شیخ، الشیخ احمد المحدث الدہلوی کا مآل الیہ بھی یہی ہے۔انہوں نے ''ردّ روح'' (روح کا لوٹنا) کا کیا مطلب لیا ہے اور اس کی ضرورت کیوں ہے؟ کیوں کہ جب دیگر ارواح مؤمنین کے (اپنے) زائرین سے شعور اور ان کے سلام اور ردّ سلام (سلام لوٹانے) کے بارے میں احادیث وارد ہوئی ہیں تو حضرات انبیاء کرام کے حق میں اس معنی کے واقع ہونے کے کیا کہنے۔ پھر بھی ردّ روح (روح کے لوٹنے) کی صورت میں ہر گھڑی اور ہر دن جس کثرت سے آنحضرتؐ پر سلام بھیجا جاتا ہے اسی تعداد میں ان کی موتات کثیرہ لازم آتی ہے۔ یہ عقیدہ اس مذہب جمہور کے منافی ہے جو انبیاء صلوات اللہ علیہم کی جسمانی حیات (بعد ممات) کے قائل ہیں۔میرے سامعین نے میری تقریر کی پہلی شق اور حدیث کی توجیہ کا انکار کیا اور یہ کہا کہ انبیاء کی حیات جسمانی (بعد ممات) نہ تو کسی کا عقیدہ ہے اور نہ ہی کسی کو یہ بات معقول نظر آتی ہے۔ میں نے کہا کہ بعض محدثین اس طرف گئے ہیں اور متاخر احناف نے بھی یہ بات کھل کر بیان کی ہے۔ان دوستوں نے میری بات کو جھٹلایا۔ میں نے کتاب پیش کی، انہوں نے استدلال مانگا۔ میں نے کہا: ناقل کے لیے نقل کی صحت ضروری ہے نہ کہ استدلال۔البتہ جب میں استدلال پر آیا تو میرے ان دوستوں نے انکارِ حدیث کیا اور معتبر کتب احادیث کو بھی جھٹلایا۔ میں نے جب دیکھا کہ اس مجلس میں میری بات سننے والا کوئی نہیں تو مجھے شیخ سعدی کے جدال کی حکایت یاد آگئی (۳۰) اور میں

چپکے سے اپنے حجرے میں چلا آیا اور کہا:

ہمان یگانۂ عصرم چو مقریِ تسبیح
چہ شد کہ خلق نیارند در شمار مرا

اس بات کو دو ہفتے گزر گئے تو ایک دوست میرے پاس آئے اور کہا کہ بعض طالب علم جو اس مسئلے کا انکار نہیں کرتے اور کوئی علمی تبحر بھی نہیں رکھتے، وہ چاہتے ہیں کہ آپ اس مسئلے پر فرقۂ ثانیہ کے معتبر اقوال، دونوں مذاہب کی احادیث کی توجیہ اور اس مسئلے پر خود اپنی تحقیق فارسی زبان میں لکھیں تا کہ عامۃ الناس بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ناچار یہ چند سطریں حوالۂ قلم کی جاتی ہیں''۔

اس کے بعد مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ انبیاء خدا کی سنت کے مطابق ایک دفعہ جسمانی اور طبعی موت سے ضرور دوچار ہوتے ہیں، لیکن ان کی روحیں انہیں لوٹا دی جاتی ہیں اور وہ حیات رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف نے حسب ذیل اکابر اور ان کی کتب سے اقوال نقل کیے ہیں۔

ابومنصور عبدالقاہر بن طاہر بغدادی، بیہقی کی کتاب الاعتقاد سے، شیخ عفیف الدین یافعی ، شیخ ابوالحسن شاذلی، ابونعیم کی دلائل النبوت سے، سہیلی کے رسالہ در مسئلہ حیات انبیاء با بدان در قبور سے، صاحب تلخیص، امام الحرمین، شہرستانی، تاج الدین السبکی شافعی کی شفاء الاسقام سے، شیخ جلال الدین سیوطی کی انموذج اللبیب فی خصایص الحبیب سے، قرطبی کے تذکرہ سے، ملا علی قاری کی شرح حصن حصین سے اور افضل متاخرین محدث حنفی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مدارج النبوۃ، جذب القلوب، شرح مشکوۃ، مکتوبات اور رسالۂ سلوک اقرب السبل سے۔

یہ سب نقل کرنے کے بعد بابا محمد عثمان نے اپنی رائے یوں دی ہے:

''باوجود صحیح احادیث اور اکابر کے اقوال کے، مناسب یہ ہے کہ ہم فرقۂ اولیٰ (یعنی منکرین) کے کلام کی تاٴویل بھی اسی مفہوم اور معنی کے مطابق کریں۔ جہاں تک ممکن ہو اور اگر کسی کا فلسفہ میں غور وفکر کے بعد مزاج معتزلی ہو گیا ہے تو وہ بھی انکارِ محض نہیں کرتا، کم از کم حیات کا قائل ہو جاتا ہے البتہ اس کی کیفیت کو شارع کے علم سے مفوض سمجھتا ہے کما ھی

المرتبه الادنی فی سایر الاحوال البرزخیه من العذاب الجسمانی والتنعم الجسدانی وغیرها، ایسا نہیں ہے کہ یہ لوگ نصوص کو مجاز قرار دیتے ہیں۔ سبحان اللہ! لوگوں پر فلسفیت کس قدر غالب آچکی ہے، کیوں کہ یہ بات خود جب نصوص اور اجماع کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ یہ لوگ حیات بعد الموت کے قائل ہیں اور موت کی اصل کا انکار نہیں کرتے جس سے نص اور اجماع کی مخالفت ہوتی اور یہ امر ممکن ہے جس کی خبر مخبر صادقؐ نے دی ہے اور علمائے امت اس طرف گئے ہیں۔ پس انکار کیسا؟ واللہ اعلم بالصواب۔ فریقین کے مذہب کے مطابق حدیث ردّ روح کی بہترین تاویل یہ ہے کہ ردّ روح اشارہ ہے دراصل حضرت قدس کے شہود کے استغراق سے مقدس اور مطہر روح کے توجہ اور اقبال اور اس عالم کی طرف مشاہدۂ ملاء اعلیٰ اور اس کے افاقت اور ادراک کے مراحل کی طرف۔ تاکہ تدارکِ سلام اور اس کا جواب لوٹایا جانا میسر آسکے۔ یعنی نبی کی روح پاک کو معنوی التفات، روحانی نزول اور بشریت کا اثر حاصل ہوجاتا ہے تاکہ اپنی امت کے سلام کا جواب دے سکے''۔

اس رسالے کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے: سپاس تقدس اساس حکیم روان آفرینی (را) کہ حلول روح پاک در حلہ خاک و نزول این جوہر لطیف درچنین منزل کثیف مانند آب نیسان درصدف قطرہ واریست۔

کشف المعانی: یہ رسالہ نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد کے جنرل کلیکشن (شمارہ NAP-46) میں محفوظ ہے۔ محرم ۱۱۷۶ھ کے اوائل میں بخط شکستہ تیرہ اوراق میں کتابت ہوا۔ نسخے کے آخری ملحقہ ورق پر ایک فارسی نعت درج ہوئی ہے جس میں تخلص ''معظم'' آیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے نسخہ فروش نے نسخہ کے ابتدا میں یہ نوٹ لکھا ہے کہ اس رسالے کا مصنف محمد معظم ہے اور یہ بابا محمد عثمان کشمیری کے رسالے کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ لیکن مجھے نہ تو محمد معظم کا نام اور نہ ہی بابا محمد عثمان کشمیری کا نام اس کتاب میں ملا۔ نہ اس بات کی تصدیق کسی دوسرے ذریعے سے ہوسکی۔ چون کہ ملحقہ نوٹ میں بابا محمد عثمان کشمیری کا نام آیا ہے اس لیے میں نے اس رسالے کا ذکر یہاں کرنا مناسب سمجھا۔

کشف المعانی دس فلسفیانہ اور عارفانہ سوالات کے جواب پر مشتمل ہے اور اس کا تعلق

حیات انبیاء بعد ممات سے نہیں ہے۔(۳۱)

حواشی

(۱) یہ غالباً نادر شاہ افشار کے دہلی پر حملے (۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء) کی طرف اشارہ ہے۔(۲) فقیر محمد جہلمی، حدائق الحنفیہ، مرتبہ مع حواشی وتکملہ خورشید احمد خان، مکتبۂ حسن سہیل لمیٹڈ، لاہور، صدی ایڈیشن (۱۴۰۰ھ)، ص ۴۷۶۔ (۳) رحمان علی، تذکرۂ علمائے ہند، مطبع منشی نول کشور، لکھنو، ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ/نومبر ۱۹۱۴ء، بار دوم، ص ۲۷۵؛ نیز: مرتبہ ومترجمہ محمد ایوب قادری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۵۹۱۔ (۴) حاجی محی الدین مسکین کشمیری، تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار، مطبع سورج پرکاش، امرت سر، ۱۳۲۱ھ، ص ۲۵۷-۲۵۸۔ (۵) ایضاً، ص ۲۵۸۔ (۶) ایضاً، ص ۱۶۹-۱۷۰۔ (۷) ایضاً، ص ۱۹۶؛ رحمان علی، ص ۵۴۔ (۸) حاجی محی الدین مسکین کشمیری، ص ۲۲۹-۲۳۰؛ ۲۶۲؛ ۳۵۴-۳۵۵۔ (۹) ایضاً، ص ۲۴۴۔ (۱۰) فقیر محمد جہلمی، ص ۴۶۱؛ رحمان علی، ص ۲۷، حاجی محی الدین مسکین کشمیری، ص ۲۹۹۔ (۱۱) حاجی محی الدین مسکین کشمیری، ص ۳۰۰؛ رحمان علی، ص ۷۶ نے سال پیدائش ۱۱۲۷ھ اور تاریخ وفات ۲۹ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ اور فقیر محمد جہلمی، ص ۴۶۱ نے تاریخ وفات ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ لکھی ہے۔ (۱۲) حاجی محی الدین مسکین کشمیری، ص ۳۰۴-۳۰۵؛ فقیر محمد جہلمی، ص ۴۶۱؛ رحمان علی، ص ۱۷۰۔ (۱۳) حاجی محی الدین مسکین کشمیری، ص ۲۹۶۔ (۱۴) ایضاً، ص ۲۲۷؛ فقیر محمد جہلمی، ص ۴۵۴؛ رحمان علی، ص ۱۵۲؛ کشمیر میں اسی نام کے ایک اور عالم دین بھی تھے. وہ ملا سلیمان کے شاگرد تھے اور ۳۰ شعبان ۱۲۲۰ھ کو وفات پائی. دیکھیے: حاجی محی الدین مسکین کشمیری، ص ۳۰۵۔ (۱۵) حاجی محی الدین مسکین کشمیری، ص ۳۰۱۔ (۱۶) ایضاً، ص ۲۷-۳۷، مسکین نے شیخ عبدالرحیم کو شیخ محمد عابد سرہندی خلف شیخ عبدالاحد سرہندی کا مرید لکھا ہے، کتب انساب میں شیخ عبدالاحد (وحدت) سرہندی کے کسی فرزند کا نام محمد عابد نہیں ہے، یہاں غالباً ان سے سہو ہوا ہے اور شیخ عبدالاحد (وحدت) سرہندی کے خلیفہ شیخ محمد عابد سنامی مراد ہے، اس طرف میری توجہ پروفیسر محمد اقبال مجددی صاحب نے دلائی ہے جس کے لیے ان کا سپاس گزار ہوں۔ (۱۷) قاضی مبارک گوپامئوی شارح سلم العلوم شیخ محمد دائم فاروقی کے فرزند تھے، علم منطق میں کامل تھے، ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں انتقال ہوا، رحمان علی، ص ۱۷۴، ۱۷۵، عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر، مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء، ص ۲۴۷ - ۲۴۸، اختر راہی، تذکرۂ مصنّفین درس نظامی، مکتبۂ رحمانیہ، لاہور، ۱۳۹۸ھ/

۱۹۷۸ء، ص ۲۳۸ - ۲۴۱۔ (۱۸) ہمارے پیش نظر رسالہ حیات انبیاء کے نسخہ میں ''ملا احمد اللہ'' ہی تحریر ہوا ہے، اگرچہ اس نام کے علماء بارہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں گذرے ہیں جیسے مولوی احمد اللہ پانی پتی متوفی ۱۱۹۸ھ (رحمان علی، ص ۱۴) اور قاضی احمد اللہ بلگرامی زندہ ۱۱۹۶ھ (رحمان علی، ص ۱۵)، لیکن یہ عمر میں بابا محمد عثمان سے کچھ چھوٹے تھے اور بابا صاحب کا ان سے تلمذ کرنا قرین قیاس نہیں ہے، میرے خیال میں یہ ملا حمد اللہ سندیلوی ہوں گے جو علم منطق کے شارح تھے اور بابا صاحب نے بھی ان سے کتب منطق پڑھنے کا ذکر کیا ہے، ''شرح تصدیقات سلم العلوم'' معروف بہ ''حمد اللہ'' ان کی مشہور تصنیف ہے، ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں دہلی میں وفات پائی، رحمان علی، ص ۵۲۔ (۱۹) میر زاہد ہروی (م ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء) نے طلبہ کی سہولت کے لیے منطق کی متداول کتابوں پر حواشی لکھے، جیسے حاشیۂ شرح مواقف، حاشیۂ شرح تہذیب المنطق علامہ دوانی، حاشیۂ رسالہ تصور و تصدیق قطب الدین رازی، زبید احمد/ترجمہ شاہد حسین رزاقی، ص ۱۶۳، اختر راہی، ص ۲۳۴ - ۲۳۷۔ (۲۰ و ۲۱) سلم العلوم منطق میں اور مسلم الثبوت اصول فقہ میں قاضی محبّ اللہ بن عبدالشکور بہاری (م ۱۱۱۹ھ/ ۸-۱۷۰۷ء) کی تصانیف ہیں، رحمان علی، ص ۱۷۵-۱۷۶۔ (۲۲) لاہور میں ایک حنفی عالم دین قاضی محمد افضل لاہوری جو ابوتراب ابن نجیب الدین شیرازی کے شاگرد تھے، گذرے ہیں، ان کا انتقال ۱۰۹۲ھ میں ہوا، (عبدالحی حسنی، ج ۵، ص ۳۶۱)، یقیناً یہ ہمارے ممدوح کے اساتذہ میں سے نہ ہوں گے، کیوں ان کا زمانہ قدرے پہلے کا ہے۔ (۲۳) بابا محمد عثمان کشمیری نے اپنی تحریر میں لفظ ''نبایر'' استعمال کیا ہے، اگر نبیرہ سے مراد راست یا پہلا پوتا ہے تو یہ زمانہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ان تین نبیروں (پوتوں) کا ہوسکتا ہے: شیخ نوراللہ بن شیخ نورالحق (۹۸۳ھ - ۹ شوال ۱۰۷۳ھ) بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ابوالمفاخر بن شیخ علی محمد بن شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور محمد عاصم بن شیخ محمد ہاشم بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی، یہ سب اصحاب فضل و تصانیف سے تھے اور درس و تحقیق حدیث سے شغف رکھتے تھے، آگے ان کی اولاد بھی مثلاً شیخ سیف اللہ بن شیخ نوراللہ، حافظ محمد فخرالدین بن شیخ محبّ اللہ بن شیخ نوراللہ اور شیخ الاسلام محمد بن حافظ فخرالدین کو بھی حدیث سے شغف تھا، شیخ الاسلام محمد، نادر شاہ کے حملہ (۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء) تک دہلی میں رہے اور صدرالصدور کی خدمات انجام دیتے رہے، خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، عکسی اشاعت مکتبۂ رحمانیہ، لاہور، بلا تاریخ، ص ۲۴۶ - ۲۵۷۔ (۲۴) اس فہرست میں حجۃ اللہ البالغہ، لمعات، تأویل الاحادیث، عقد الجید، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، قول الجمیل اور ہمعات حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف ہیں ۔ (۲۵) سکھ جیون کی کشمیر میں

کار پردازی کی مدت آٹھ سال اور چار ماہ (۱۱۶۸ھ تا ۱۱۷۵ھ / ۱۷۵۵ تا ۱۷۶۲ء) ہے، نورالدین خان نے اس کی آنکھوں میں سلائی پھروادی تھی

در ہزار ویک صد و ہفتاد و پنج
سوکھ جیون شد تبہ با مال و گنج

دیکھیے: کرپارام، گلزار کشمیر، طبع ہند، ۱۸۷۱ء، ص ۲۳۳

(۲۶) احمد شاہ درانی نے ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء میں پنجاب پر حملہ کیا۔ (۲۷) بابا محمد عثمان کشمیری، رسالہ مسئلہ حیات انبیاء (فارسی)، قلمی، نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد، ذخیرۂ مفتی، شمارہ: اسلام ۶۴۲، ورق ۸۶-۸۷۔ (۲۸) خود حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بھی بابا عثمان کشمیری کے نام متعدد خطوط موجود ہیں، جو تصوف کے اعلیٰ مضامین پر مشتمل ہیں، دیکھیے: نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، تحقیق و ترجمہ نسیم احمد فریدی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت، ۱۹۹۸ء، ۲ جلدیں؛ نیز: مکاتیب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، تحقیق مفتی نسیم احمد فریدی امروہوی، مقدمہ و تحشیہ نثار احمد فاروقی، کتابخانۂ رضا رام پور، ۲۰۰۴ء، گیارہ خطوط بنام بابا عثمان۔ (۲۹) نسخے میں لفظ ''بکن'' پڑھا جاتا ہے لیکن اس کا کوئی مطلب یہاں صحیح نہیں بیٹھتا۔ (۳۰) شیخ سعدیؒ نے گلستان کے باب ہفتم در تاثیر تربیت میں ایک طویل حکایت ''جدال سعدی با مدّعی در بیان توانگری و درویشی'' لکھی ہے۔ (۳۱) Masood Ahmad Khan, *Descriptive Catalouge of Manuscripts, Deparatment of Archives,Government of Pakistan*, Islamabad, 1974, p 14

احمد منزوی نے فہرست مشترک نسخہ ھای خطی فارسی پاکستان، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء، جلد ۳، ص ۱۷۹۹ اور فہرستوارۂ کتابھای فارسی، مرکز دائرہ المعارف بزرگ اسلامی، تہران، ۲۰۰۳ء، جلد ۷، ص ۷۵۴ میں مسعود احمد خان کی مذکورہ بالا فہرست کے حوالے سے کتاب کا نام ''کشف المعنی'' اور مصنف کا نام ''بابا محمد عثمانی'' لکھا ہے، یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں، خود مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے: ''این اوراق کہ بہ کشف المعانی موسوم گشت'' (ورق ۲ الف) لہٰذا اس کا نام کشف المعانی ہی صحیح ہے، مسعود احمد خان نے بھی غالباً نسخہ فروش کی یادداشت کی مدد سے یہ بات لکھی ہے کہ یہ رسالہ بابا محمد عثمان کے رسالہ کے جواب میں ہے۔

ہندوستان میں فارسی مثنوی سرائی کا ایک اجمالی جائزہ

پروفیسر سید انوار احمد

ہندوستان میں مغلوں کے تسلط سے پہلے غزنویہ حکمرانوں اور سلاطین مملوک کے ادوار میں مثنوی سرائی کی طرف مائل شاعروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔اس طویل عرصے میں جو سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے ایام سلطنت سے ابراہیم لودی کے دورۂ سلطنت کو محیط ہے ، بہت سارے باکمال شعراء منصۂ شہود پہ جلوہ گر ہوئے ،لیکن ان کی شعر گوئی بیشتر قصیدہ،غزل،قطعات ور باعیات کی صنفوں پہ مشتمل ہے،تاہم مجموعی اعتبار سے ہندوستان میں مغلوں سے قبل کا یہ دور درخورِ توجہ ہے اور ادبی لحاظ سے قدر و اہمیت کا حامل ہے۔شعر وسخن کے علاوہ اس عصر میں نثر نگاری کے مختلف شعبوں میں دانش مندوں نے نہایت گراں مایہ کارنامے انجام دیئے ہیں۔خصوصیت سے تاریخ نویسی کی صنف میں ''تاج المآثر'' مولفہ حسن نظامی نیشا پوری ،''طبقات ناصری'' مصنفہ مولانا منہاج الدین عثمان ،''تاریخ فیروز شاہی'' تالیف ضیاء الدین برنی ،''فتوحات فیروز شاہی'' تصنیف شمس سراج عفیف جیسی وقیع وبیش بہا کتابیں لکھی گئیں۔اس کے علاوہ یہ زمانہ فرہنگ نویسی ،مکتوب نگاری اور آثار عرفانی کے لیے بھی نہایت ارزشمند ہے۔فرہنگ قواس ، لسان الشعراء، زفان گویا اور ''شرف نامہ منیری'' جیسے بیش قیمت لغات کی تصنیف کا تعلق اسی عہد سے ہے۔حضرت ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری نے اسی زمانے میں ۴۷۰ھ میں اسلامی تصوف پہ اپنی مستند و معروف کتاب موسوم بہ ''کشف المحجوب'' لکھی۔فخر مدبر کے دو اہم نثری کارناموں ''آداب الحرب والشجاعۃ'' اور ''شجرۂ انساب'' کا بھی تعلق اسی دور سے ہے۔حضرت مخدوم شیخ

مسکن کوٹھی، باقر گنج گولہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴، بہار۔

شرف الدین یحییٰ منیری کی مکتوبات صدی، مکتوبات دوصدی، شرح آداب المریدین، ارشاد السالکین، ارشاد الطالبین، فوائد المریدین وغیرہ اسی عہد میں معرض تخلیق میں آئیں۔

بہر حال اس عہد کے معروف و معتبر شاعروں میں امیر خسرو اور حسن سجزی کے علاوہ مسعود سعد سلمان، نکتی لاہوری، ابو الفرج رونی، شہاب الدین مہمرہ، فقیہ الدین، عصامی، بدر چاچ، شیخ بوعلی قلندر پانی پتی، سلطان احمد چرم پوش متوفی ۷۷۹ھ، مولانا مظفر بلخی متوفی ۷۸۸ھ، حضرت نوشہ توحید اور احمد لنگر دریا وغیرہ ہیں۔ لیکن مثنوی سرائی کے میدان میں امیر خسرو سے قطع نظر جو بلا شبہ شمار و معیار دونوں اعتبار سے اس میدان کا شہسوار یکہ تاز ہے، کوئی مقتدر و عالی مقدار شاعر نظر نہیں آتا۔ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر نے متصوفانہ موضوع پہ ایک مختصر مثنوی موسوم بہ ''ہدایت و بشارت'' لکھی تھی۔ موصوف ایام شباب میں ہی عراق سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے تھے۔ کچھ دنوں دہلی میں اقامت کے بعد شہر پانی پت منتقل ہو گئے۔ اسی شہر میں ۷۲۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ شیخ کی یہ مثنوی اسرار تصوف کے شرح و بیان سے متعلق ہے۔ اس مثنوی پہ مولانا روم کے طرز تفکر اور شیوۂ بیان کا خاصا اثر ہے۔ مثنوی کے چند ابتدائیہ اشعار بشرح ذیل ہیں:

مرحبا ای بلبل باغِ کہن   از گل رعنا بگو باما سخن
مرحبا ای ہدہد فرخندہ فال   مرحبا ای طوطیٔ شکر مقال
مرحبا ای قاصد طیار ما   می دہی ہردم خبر از یار ما

اور اختتامیہ دو شعر اس طرح ہیں:

گر حرامت میکنی برخود حلال   میکنی تسکین دلت باصد ملال

مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کے مرید و خلیفہ حضرت مولانا حسین نوشتہ توحید متوفی ۸۴۴ھ جو سلسلۂ فردوسیہ کے ایک بلند مرتبت صوفی اور مستند شاعر تھے نے بھی ایک مثنوی موسوم بہ ''افتخار حسینی'' لکھی تھی۔ اس مثنوی میں ''قصۂ چہار درویش'' کو منظوم کیا گیا ہے۔ حضرت نوشتہ توحید کی یہ مثنوی ''مثنویٔ مولوی'' کے وزن میں ہے۔ داستان سرائی کے ساتھ جا بہ جا اس میں تصوف کے غوامض و نکات کی توضیحات بھی ملتی ہیں۔ عصامی جس کے احوال حیات تاریخی مآخذ

اور تذکروں میں نہیں ملتے، تغلق سلطنت کے عہد کا ایک ہنرور شاعر تھا، اس نے ''فتوح السلاطین'' نام کی ایک منظوم تاریخ لکھی تھی۔ یہ منظوم تاریخ جو ''شاہنامہ فردوسی'' کے وزن میں لکھی گئی ہے، ہندوستان کے غزنوی اور مملوک سلاطین کے تین سو پچاس سال کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد سے لے کر سلطان محمد بن تغلق کے حالات اس میں شامل ہیں۔ عصامی نے واقعات کی فراہمی میں بڑی دقت و تحقیق کا ثبوت دیا ہے۔ ''فتوح السلاطین'' بارہ ہزار ابیات پہ محتوی ہے۔ یہ مثنوی سلطان علاء الدین بہمن شاہ کی خدمت میں تقدیم کی گئی تھی۔ عصامی کو واقعات کی ترتیب میں بڑی مشقتیں اٹھانی پڑی تھی، جس کی بابت وہ بقرار ذیل اشارے کرتا ہے:

حدیثی کہ بشنیدم از باستان کشیدم بہ نظمش در ایں داستان
دگر آنچہ اندر کتب یافتم سر از درج آن نیز کم تافتم
پراگندہ بس در قیمت گراں کشیدم در این سلک چوں ناقداں
بہ تحقیق افسانہ ہای کہن ببردم بسی رنج در ہر سخن

مملوک سلاطین کے عہد کا جلیل القدر شاعر جو ہندوستان کا عظیم ترین شاعر محسوب کیا جاتا ہے دس مثنویوں کا خالق ہے۔ پانچ مثنویاں اس نے تاریخی موضوعات پر لکھیں اور دیگر پانچ مثنویاں خمسۂ نظامی کی تقلید میں منظوم کیں۔ تاریخی مثنویوں میں قران السعدین، مفتاح الفتوح، دولرانی خضر خان، نُہ سپہر اور تغلق نامہ ہیں جبکہ خمسہ خسروی کے عناوین اس طرح ہیں۔ مطلع الانوار، شیرین و خسرو، مجنوں و لیلیٰ، آئینۂ اسکندری اور ہشت بہشت، جو نظامی کی مثنویات موسوم بہ مخزن الاسرار، خسرو و شیرین، لیلی و مجنوں، سکندر نامہ اور ہفت پیکر کے جواب میں لکھی گئیں۔ امیر خسرو بلاشبہ نظامی کا موفق ترین مقلد ہے۔ خمسۂ نظامی اس کی تمام عمر کا سرمایہ ہے جبکہ امیر خسرو نے اپنے خمسہ کی ساری مثنویوں کو محض تین سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ خسرو کی تاریخی مثنویوں میں اولین مثنوی قران السعدین ہے جو سلطان بغرا خان اور اس کے بیٹے کیقباد کی ایک دوسرے کے خلاف لشکر آرائی اور انجام کار دونوں کے درمیان مسالمت و مصالحت پہ محتوی ہے۔ یہ مثنوی اگرچہ موضوع کے اعتبار سے بیزار کن اور ناخوش گوار ہے لیکن امیر خسرو نے

بزم ورزم کی واقعہ نگاری کے ذریعہ اس میں تفریح ونشاط کے عناصر کو منظوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ خسرو نے اسے مطبوع ومقبول بنانے کے لیے رقص وسرور کی محفلوں کے مناظر اور ضیافتوں کی مشروح ومفصل واقعات کی عکاسی کی ہے۔ دوسری مثنوی مفتاح الفتوح ہے جو ۶۹۰ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ مثنوی جلال الدین فیروز شاہ خلجی (۶۹۵ - ۶۸۹ھ) کے جنگی معرکوں اور فتوحات کے وقائع پہ مشتمل ہے۔ امیر خسرو کی تیسری تاریخی مثنوی دولرانی خضر خان ہے۔ اس مثنوی کا دوسرا نام عشقیہ بھی ہے۔ یہ خضر خان فرزند سلطان علاء الدین اور دیول دیوی دختر راجہ کرن والیٔ گجرات کی عشقیہ داستان پہ مبنی ہے۔ جب امیر خسرو نے اس مثنوی کو خضر خان کے نام تقدیم کیا تھا، اس وقت اس کی ابیات کی تعداد بیالیس سوتھی (۴۲۰۰) لیکن خضر خان کے قتل کے بعد امیر خسرو نے اس میں اضافے کیے اور ابیات کی تعداد چار ہزار پانچ سوانیس (۴۵۱۹) تک پہنچ گئی۔ امیر نے اس مثنوی کو ۷۱۵ھ میں انجام تک پہنچایا تھا۔ خسرو کی چوتھی تاریخی مثنوی نُہ سپہر ہے۔ قطب الدین مبارک شاہ خلجی (۷۱۶ - ۷۲۰ھ) نے اس مثنوی کو منظوم کرنے کی فرمائش کی تھی۔ یہ مثنوی ۷۱۸ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کے اشعار کی تعداد پانچ ہزار چار سونو ہے (۵۴۰۹)۔ نُہ سپہر نو حصوں پہ مبنی ہے۔ ہر بخش کو سپہر کہا گیا ہے اور ہر سپہر کے لیے جداگانہ بحر کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس مثنوی میں جنوبی ہند میں خسرو خان کی لشکر کشی کا ذکر ہے۔ یہ منظومہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ امیر خسرو نے اس میں ہندوستان کی ثقافت اور مراسم مذہبی کا شرح وتفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

امیر خسرو کی آخری تاریخی مثنوی تغلق نامہ ہے۔ خسرو کی یہ مثنوی مکمل نہ ہوسکی تھی۔ مغل شاہنشاہ جہاں گیر کے عہد میں اس کی بازیافت ہوئی۔ بادشاہ کے حکم سے حیاتی گیلانی (متوفی ۱۰۱۵ھ) نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس مثنوی میں حیاتی گیلانی کے ایک سوانتیس (۱۲۹) ابیات شامل ہیں۔

غزالی مشہدی معنی طراز ومبتکر شاعر تھا لیکن اپنے ملحدانہ خیالات اور غیر سنجیدہ مذہبی افکار واظہارات کے سبب وہ اپنے ہم وطنوں کی شنعت ونفرت کا نشانہ بن گیا تھا۔ ساکنان مشہد اس درجہ اس سے منزجر ومتوحش ہوئے کہ وہ ترک وطن پہ مجبور ہوگیا۔ وہ ہندوستان کے لیے عازم سفر ہوا اور دکن کے راستے کو طے کر کے جونپور پہنچا۔ حاکم جونپور خان زمان نے اس کے فضل وہنرو

شاعرانہ قدرت واستعداد کی قدردانی کی۔غزالی نے خان زمان کی مدح میں ''نقش بدیع'' نام کی مثنوی لکھی تھی۔ یہ مثنوی ہزار شعروں پہ مشتمل ہے۔خان زمان نے ہر شعر کے عوض ایک اشرفی غزالی کو بخشش کے طور پہ عطا کیا تھا۔اس مثنوی کے کچھ اشعار بقرار ذیل ہیں:

خاک دل آنروز کہ می بیختند   شبنمی از عشق برو ریختند
دل کہ بہ آن رشحہ غم اندود شد   بود کبابی کہ نمک سود شد
بی اثر مہر چہ آب و چہ گل   بی نمک عشق چہ سنگ و چہ دل

خان زمان کی وفات کے بعد غزالی دربار اکبری سے وابستہ ہوا اور یہاں وہ ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔شاہان مغل کا یہ پہلا ملک الشعراء تھا۔اس نے یہاں مراۃ الصفات نام کی مثنوی لکھی۔اس مثنوی کے چند اشعار اس طرح ہیں:

تاج دہ تارک روئین تنان   سرشکن گرز قوی گردناں دنان
شاہ فلک مسند و خورشید رشک   ملک ستایندہ و اقلیم بخش
گر بہ کشد تیغ جہان سوز را   قطع کند سلک شب و روز را

نقش بدیع اور مراۃ الصفات کے علاوہ اس کی مثنویوں کی فہرست میں مشہد انوار، آئینۂ خیال، واردات اور مواہب وغیرہ شامل ہیں۔غزالی کی وفات ۹۸۰ھ میں ہوئی۔دربار اکبری کا ملک الشعراء فیضی فیاضی نے بھی خمسۂ نظامی کے جواب میں پانچ مثنویوں کو نظم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔اس ہدف کی تحصیل میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی تھی۔لیکن سرانجام مثنوی نل دمن کے سوا فیضی کی مثنوی کو مکمل نہیں کر سکا۔نل دمن کو فیضی نے انچاس سال کی عمر میں مکمل کیا تھا۔اس وقت اکبر کی بادشاہی کا انچالیسواں سال تھا۔فیضی نے اس مثنوی کو لیلیٰ مجنوں کے جواب میں منظوم کیا تھا۔یہ مثنوی چار ہزار دوسو ابیات پر حاوی ہے۔اس کی داستان قدیم ہندوستان کی معروف رزمیہ کہانی ''مہابھارت'' سے ماخوذ ہے۔فصاحت وروانی اور فکر واندیشہ کے اعتبار سے یہ ہندوستان میں لکھی گئی تمام مثنویوں میں افضل ہے۔یہ مثنوی ہندوستان کی قدیم ثقافت وفرہنگ اور مذہب وروایت کی آئینہ داری کرتی ہے۔اس بنا پہ شاہان مغل کے عہد میں یہ بے حد مقبول ہوئی۔بدایونی فیضی سے بغض وعداوت رکھنے کے باوجود اس کے اس شعری کارنامے کی ستایش کرتا ہے۔بدایونی اس

منظومے کی بابت اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتا ہے ’’والحق مثنویست کہ در این سیصد سال مثل آن بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسی دیگر نگفتہ باشد‘‘۔فیضی کی نامکمل مثنویاں ’’مرکز ادوار‘‘، ’’سلیمان بلقیس‘‘، ’’اکبر نامہ‘‘ اور ’’ہفت کشور‘‘ ہیں جو نظامی کی مخزن الاسرار، شیریں خسرو، سکندر نامہ اور ہفت پیکر کے جواب میں لکھی جارہی تھیں۔محمد رضا ی نوعی خبوشانی قریۂ خبوشان من مضافات خراسان سے ترک وطن کر کے بادشاہ اکبر کے زمانہ سلطنت میں ہندوستان آیا اور شاہزادہ دانیال کی ملازمت سے وابستہ ہوا۔شاہزادہ کی رفاقت میں وہ لاہور میں مقیم تھا جہاں اس نے ایک ہندو نوجوان کی نعش پہ اس کی زوجہ کے ستی ہونے کے واقعہ کو دیکھا تھا جس سے وہ بے حد ملول و متاثر ہوا۔چنانچہ شاہزادہ موصوف کے ایما پر اس واقعہ کو مثنوی کی صورت میں منظوم کیا۔یہ مثنوی مسمی بہ سوز و گداز بہت مقبول ہوئی۔نوعی کی وفات ۱۰۱۹ھ میں برہان پور میں ہوئی۔مثنوی ’’سوز و گداز‘‘ کو پروفیسر امیر حسن عابدی نے مرتب کیا ہے اور برسوں پہلے بنیاد فرہنگ ایران سے اس کی اشاعت و طباعت ہوئی تھی۔عہد جہاں گیر میں سعد اللہ مسیحا پانی پتی نے ہندوستان کے حماسی منظومہ رامائن کی بنیاد پہ ’’رام سیتا‘‘ نام کی مثنوی لکھی ہے جو شائستہ توجہ ہے۔مسیحا پانی پتی ملاشیدا کے ہم صحبتوں میں تھا۔اس مثنوی میں عفت سیتا سے اس کا درج ذیل شعر نہایت معنی خیز ہے:

تنش را پیرہن عریان ندیدہ　　　چون جان اندر تن و تن جان ندیدہ

مسیحا نے رامائن کو فارسی میں منظوم کرنے کے قصد سے بنارس میں رہ کر سنسکرت زبان سیکھی تھی۔یہ مثنوی ۱۸۹۹ء میں نول کشور پریس سے چھپ چکی ہے۔مسیحا کی رامائن اور دوسری منظوم فارسی رامائنوں پہ مکارم شعری کے لحاظ سے فوقیت رکھتی ہے۔

اس مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

خداوندا ز جام عشق کن مست　　　کہ در مستی فشانم در جہان دست

مسیحا ہندو خواتین کی صفات بیان کرتا ہے:

زن است و می کند کار جوان مرد　　　کز و ہنگامۂ پروانہ شد سرد
بمردن عاشقان بی اختیار اند　　　ولی معشوق اینجا جان سپارند
ہمی بینم بسی ہندی نژادان　　　کہ خود را بر صنم سازند قربان

اس مثنوی میں ہفت سیدالمرسلین سے متعلق ایک شعر مطبوع خاص و عام ہوا ہے جو بقرار ذیل ہے:

دل از عشق محبت ریش دارم رقابت با خدای خویش دارم

جہاں گیر کے عہد حکومت میں گردھر داس نے بھی ایک فارسی رامائن منظوم کی تھی۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

ثنا و شکر آن بخشندہ جان را پدید آورد کو ہر دو جہان را

اورنگ زیب کے عہد میں چندرمن بیدل پسر سری رام لاہوری نے نرگستان کے عنوان سے رامائن کو منظوم کیا تھا۔ اس مثنوی کی تکمیل ۱۱۰۵ھ میں ہوئی تھی۔ نرگستان چھ دفتروں پہ مشتمل ہے۔ پانچ دفتر بحر ہزج میں نظم کیے گئے اور چھٹے دفتر میں بحر متقارب کا استعمال اس بنا پر ہوا کہ جنگ کے ماجرا کو بیان کرنا تھا۔

امانت رائے امانت کی معروف رامائن بھی حایز اہمیت ہے۔ یہ ضخیم منظومہ تیس ہزار ابیات پہ محتوی ہے۔ اس مثنوی کو نظم کرنے میں پینتیس سال صرف ہوئے تھے۔

محمد اکرم غنیمت مشہور عشقیہ مثنوی ''نیرنگ عشق'' کا خالق ہے۔ غنیمت لاہور کے مضافات میں واقع قصبۂ کنجاہ کا باشندہ تھا۔ میر محمد زمان راسخ کی خدمت میں اس نے مشق سخن کی تھی۔ غنیمت اپنی خداداد شعری لیاقت کے سبب اپنے معاصر شاعروں پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس مثنوی کی داستان میرزا عبدالعزیز خلف والی سیال کوٹ کا ایک رقاص امرد پسر پر فریفتہ ہوجانے سے متعلق ہے۔ اس مثنوی کے چند ابتدائیہ اشعار بقرار ذیل ہیں:

بنام شاہد نازک خیالان عزیز خاطر آشفتہ حالان

زمہرش سینہ ہا جولان گہ برق دل ہر ذرہ در جوش انا الشرق

دل مستان عشق خود مقامش شکست رنگہا مہتاب بامش

اور خاتمۂ کتاب بصورت زیرین ہے:

چو احوال عزیز نیک فرجام بدین صورت کہ گفتم یافت انجام

مرا آمد زروی حسن ارشاد دو مصرع از کلام مولوی یاد

متاب از عشق رو گرچہ مجازیست کہ آن بہر حقیقت کارسازیست
بیا ای ساقی میخانۂ راز غنیمت کش نگاہی برمن انداز
شرابی دہ کہ صورت بر گدازم بحسن لا یزالی عشق بازم

ہندوستانی قصوں کی بنیاد پر جو فارسی مثنویاں لکھی گئیں ان میں عاقل خان رازی کی مہر و ماہ اور شمع و پروانہ نہایت جالب و دل انگیز ہیں۔پہلی مثنوی منوہر اور موہد مالت کے قصے پہ مبنی ہے اور دوسری مثنوی راجہ رتن سن اور پدماوت کی داستان ہے، پدماوت کی کہانی کا نام رت پدم بھی ہے۔اس قصے کو ملک محمد جائسی نے اودھی زبان میں ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ کے لیے لکھا تھا۔ملا عبدالشکور پسر شیخ منور نے اس کو فارسی زبان میں منتقل کیا تھا۔عاقل خان رازی سے قبل جہاں گیر کے زمانہ سلطنت میں بزمی گرجی ترک وطن کر کے ۱۰۲۸ھ میں گجرات آیا تھا۔اس نے تین ہزار چودہ ابیات کے احاطے میں پدماوت کو منظوم کیا تھا۔بزمی کی وفات آگرہ میں ۱۰۷۳ھ میں ہوئی۔ بزمی کی مثنوی پدماوت کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

ای نام تو نقش لوح جانہا درماندہ بوصف او زبانہا

یہ مثنوی لکھنؤ سے ۱۸۴۴ء اور ۱۸۶۵ء میں منطبع ہو چکی ہے۔عہد اورنگ زیب میں میر عسکری، عاقل خان رازی متوفی ۱۱۰۸ھ نے بھی پدماوت کو مثنوی کی صورت میں منتقل کیا۔عاقل خان کے آبا و اجداد کا وطن خاف تھا لیکن اس کی زادگاہ ہندوستان ہے۔وہ اورنگ زیب کے جلیل القدر امراء میں شمار ہوتا تھا۔چہار ہزاری منصب سے سرفراز ہوا تھا۔اور دارالخلافہ دہلی کی گورنری کے عہدے پہ بھی امتیاز و اقتدار کے ساتھ فائز رہا۔عاقل خاں کی پدماوت حمد ایزد متعال و نعت سیدالمرسلین وغیرہ کے بعد اس طرح شروع ہوتی ہے:

قصہ پرداز ہندی افسانہ محرم راز شمع و پروانہ
چون ازین قصہ دم کشید چو شمع شعلہ زد این چنین دمش در جمع
کہ بہ ہند از شہان ہند و کیش بود شاہی بہ طالع درویش
درسکل دیپ پایتختش بود کام دل در کنار بختش بود

مثنوی کے اختتامیہ اشعار اس طرح ہیں:

راز یا بس کن این حکایتہا دم مزن دیگر از روایتہا

ما برفتیم کس نخواہد ماند یادگاری دو سطر خواہد ماند

ہرکہ ما را کند بہ نیکی یاد نام او در جہان بہ نیکی باد

پدماوت کو کچھ اور شاعروں نے بھی منظوم کیا تھا۔ آنندرام مخلص نے اس داستان کو ''ہنگامہ عشق'' کے نام سے نظم کیا تھا۔ پھر رای گوبند منشی نے تحفۃ القلوب کے عنوان سے اسے مثنوی کی صورت دی۔ ان کے علاوہ حسین غزنوی اور حسام الدین نے بھی اس عشقیہ افسانے کو منظوم کیا تھا۔ دربار شاہجہانی کا خوش فکر شاعر میرزا ابو طالب کلیم ہمدانی جو سبک ہندی کے شعرائے عظام میں شمار ہوتا ہے نے بھی ایک مثنوی بعنوان ''پادشاہ نامہ'' لکھی ہے۔ کلیم کی یہ مثنوی شاہجہاں کے شاہانہ جاہ وجلال، اس کی حکومت کے استحکام وانتظام اور اس کی عسکری و اجتماعی کامیابیوں سے متعلق ہے۔ یہ مثنوی مرحلۂ تکمیل کو ابھی نہیں پہنچ سکی تھی کہ ۱۰۶۲ھ میں اس کا انتقال ہوگیا، مثنوی کا ابتدائیہ شعر حسب ذیل ہے:

بنام خدائی کہ از شوق جود دو عالم عطا کرد و سایل نبود

اور مثنوی اس شعر پہ ختم ہوتی ہے:

چو اقبال ایں شاہ گردون سریر نبیند دگر در جہاں قلعہ گیر

عہد شاہجہانی کا معروف شاعر ابوالبرکات منیر لاہوری متوفی ۱۰۵۴ھ بھی متعدد مختصر مثنویوں کا خالق ہے۔ مثلاً آب ورنگ بتوصیف باغات اکبرآباد، درد والم در تشریح عشق اور ''در صفت بنگالہ'' وغیرہ آخر الذکر مثنوی شعری محاسن کے ساتھ علمی افادیت بھی رکھتی ہے۔ منیر نے اس مثنوی میں بنگالہ کی آب وہوا موسمی تحولات کے زیر اثر کیف وحال، باد و باران، سبزہ زار اور وہاں کی ندیوں کے تلاطم وطغیانی کو شاعرانہ ہنرمندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثنوی میں بنگالہ کے وحوش وطیور کا بھی بیان ہے۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بنام فیض بخش آتش آموز کہ دلہا گشتہ از وی فیض اندوز

بدرگاہش خرد جستہ توسل ز فیضس گشتہ انسان مظہر کل

اور خاتمہ کے اشعار بطور ذیل ہیں:

منیری جذبہ افروز معانی دلت ماہ سپہر نکتہ دانی
سخن را نیست پایانی بہ ہش باش خمش باش و خمش باش و خمش باش

نورالدین محمد ظہوری ترشیزی (متوفی ۱۰۲۵ھ) ۹۸۸ھ میں ہندوستان آیا۔ دکن پہنچ کر وہ عادل شاہ کے دربار سے وابستہ ہوا۔ ساقی نامہ کی صورت میں ایک مثنوی احمد نگر کے والی برہان شاہ کی مدح میں لکھی۔ اس کے عوض میں بادشاہ نے سو زنجیر ہاتھی، درہم و دینار، نفیس ملبوسات ظہوری کو بطور صلہ و انعام مرحمت کیا۔ اس مثنوی میں پینتالیس سو (۴۵۰۰) ابیات ہیں۔

ساقی نامہ ۱۸۴۹ء میں مطبع نول کشور سے چھپ چکا ہے۔

ہیر و رانجھا کی داستان محبت جس کا تعلق خطۂ پنجاب سے ہے ہندوستان کی رقت انگیز داستانوں میں سے ایک ہے۔ فارسی زبان میں بشمول آفرین لاہوری متعدد شاعروں نے اس عشقیہ کہانی کو منظوم کیا ہے۔ اس قصے کو فارسی میں مثنوی کی شکل دینے والا اولین شاعر سعید سعیدی تھا۔ مثنوی کے آغاز میں وہ کہتا ہے یہ داستان ہندی کا جامہ کہن پہنے ہوئے تھی، میں نے اسے حلۂ نو میں ملبوس کیا۔، کہتا ہے:

در جامۂ کہنہ بود عریاں در ہندی ہمی نمود عریاں
پیراہن نو بنظم گفتار پوشیدہ ز بندہ ہیر دلدار

سعیدی کے علاوہ ایک دوسرے شاعر بہ متخلص بہ چنابی نے بھی اس افسانے کو منظوم کیا تھا۔ اس کی مثنوی کا نام ہیر و ماہی ہے۔ اپنی مثنوی کی بابت اس طرح اظہار خیال کرتا ہے:

ایں قصہ ہمہ تمام کردم شاداں دل خاص و عام کردم
آرایش نظم دارم او را بر کرسیٔ زر نہادم او را
ممتاز بہ فارسیش کردم آزاد ز ہندویش کردم

کنہیا لعل متخلص بہ ہندی نے بھی ہیر و رانجھا کی کہانی کو منظوم کیا تھا۔ اس کی مثنوی کا عنوان ''نگارین نامہ'' ہے۔ ہیر و رانجھا کو فارسی میں منظوم کرنے والے اور دوسرے شاعروں میں میر قمرالدین منت، محمد عاشق متخلص بہ لائق ہیں لیکن ان تمام مثنویوں میں فقیر اللہ آفرین کی مثنوی مسمی بہ ''ناز و نیاز'' سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ آفرین کی مثنوی کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے:

بنام چمن ساز ناز و نیاز که خار نیازش بود سر و ناز

اور مثنوی کا آخری شعر اس طرح ہے:

گلستان کن صبح و شامم توئی چمن ساز عیش مدامم توئی

آفرین کا وطن لاہور تھا۔ وہ ایک آزاد طبع شاعر تھا۔ اپنے اوقات بیشتر قہوہ خانوں میں گزارتا تھا۔ اس کی وفات ۱۱۵۴ھ میں ہوئی۔ یہ مثنوی فرخ سیر کے زمانہ سلطنت میں مکمل ہوئی تھی۔ عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (متوفی ۱۱۳۰ھ) صنف غزل میں انفرادی طرز تفکر کا شاعر محسوب ہوتا ہے۔ اس کی غزلوں کے مختصات میں نزاکتہائے معنی، اشکالات وتلویحات اور نہایت لطیف ودقیق خیال بافیاں شامل ہیں۔ اس نے سبک ہندی کے مشخص عناصر کو منتہا کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن غزلوں کے علاوہ اس نے صنف مثنوی میں بھی نہایت شائستہ توجہ تجربے کیے۔ بیدل چار مثنویوں کا خالق ہے۔ ''محیط اعظم'' بیدل کی پہلی مثنوی ہے جو قریباً دو ہزار ابیات پہ حاوی ہے۔ شاہنامہ فردوسی کی بحر میں لکھی گئی اس مثنوی میں آٹھ ابواب ہیں۔ اس کا موضوع الٰہیات ہے اور تصوف کے معروف نظریہ وحدت الوجود کے مطالب کو بیان کرتی ہے۔ بیدل کی دوسری مثنوی موسوم بہ ''طلسم حیرت'' ہے۔ چار ہزار ابیات پہ مشتمل یہ مثنوی نظامی کی مثنوی ''شیرین خسرو'' کے وزن میں لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی کے مدعا و مفہوم کا تعلق بھی مسائل الٰہیات سے ہے۔ تصوف کے رموز ونکات کے شرح وتوضیح کے مقصد سے یہ مثنوی معرض نگارش میں آئی ہے۔ بیدل کی تیسری مثنوی مسمی بہ ''طور معرفت'' میں ایک ہزار تین سو ابیات شامل ہیں۔ اس مثنوی کو نظم کرنے کے زمانے میں بیدل میوات میں نواب شکر اللہ کا مہمان تھا۔ مثنوی خطۂ میوات کے کوہستانی مناظر کو بیان کرتی ہے۔ بیدل نے اسے محض دو روز کی مدت میں نظم کیا تھا۔ بیدل کی آخری مثنوی بعنوان ''عرفان'' ہے۔ سنائی کی مثنوی ''حدیقۃ الحقیقت'' کے وزن میں (فاعلاتن مفاعلن فعلن) لکھی گئی اس مثنوی میں خدا، انسان اور جہان کے رشتہ و پیوند کو بیان کیا گیا ہے۔ اشعار کی تعداد تقریباً چار ہزار ہے۔ بیدل نے اس مثنوی کو تین سال کی مدت میں مکمل کیا تھا۔

فرخ سیر کے دورۂ سلطنت میں میر محمد شریف الحسینی رے سے مہاجرت کر کے ہندوستان آیا تھا۔ وہ ایک مستند ومعتبر شاعر ہے، اس کے کلیات کا قلمی نسخہ کتاب خانہ خدا بخش میں تحت شمارہ

فہرست ۳۹۸ موجود ہے۔اس کلیات میں ایک مختصر عشقیہ مثنوی شامل ہے جس کا عنوان بقرار ذیل ہے ’’عاشق شدن یعقوب علی خان منگ باشی برصیغہ بیگم کہ درقریہ برم پوری بہم رسانیدہ بود‘‘۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

شنوا فسانہ ای در عشق بازی — کہ آوردم بنظم از بی نیازی
رفیق و ہم جلیسم بود مردی — حریفی مرد رندی اہل دردی

مثنوی کا اختتام اس طور ہے:

توئی عاشق توئی معشوق عالم — توی عزت دہ اولاد عالم
توئی روزی رسانِ جملہ مخلوق — توئی عاشق توئی خلاق معشوق
بلطفی کن حسینی را سرافراز — کہ گردد در جہانی عشق ممتاز

شمس الدین فقیر ہندوستان میں بارہویں صدی ہجری کا ایک باکمال شاعر تھا۔علی قلی والہ داغستانی سے اس کے بڑے گہرے روابط تھے۔فقیر شاہجہاں آباد میں ۱۱۱۵ھ میں متولد ہوا۔ اس کی وفات ناگہانی طور سمندر میں اس کشتی کے غرق ہوجانے کے سبب ہوئی جس سے وہ زیارت خانہ خدا کے بعد وہ لوٹ رہا تھا۔فقیر نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں اور اس صنف میں وہ منفرد مقام رکھتا ہے۔’’درمکنون‘‘ فقیر کی اہم ترین مثنوی ہے۔اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

خداوندا رہ تفرید بنما — بروی من در توحید بگشا
از آں را ہم ببر تا کوی مقصود — وز ایں در جلوہ گر کن روی مقصود
در دل بر رخم از لطف بگشای — وز آں پس از درم ناگہ درون آی

یہ مثنوی دوازدہ امام کے مناقب اور برجیس خاتون ملقب بہ ملیکہ بنت قیصر روم کی دل پذیر کہانی اور اس کا امام محمد حسن عسکریؑ کے حبالۂ ازدواج میں آنے کے ماجرا کو بیان کرتی ہے۔ خاتمہ کے چند اشعار اس طرح ہیں:

بحمد اللہ کہ این در گرامی — گرفت از کلک من نظم تمامی
بنام من ز دیوان ارادت — مسجل گشت توقیع سعادت
ز بحر دل چو جو شیدا من لآلی — خطابش در مکنون گشت حالی

فقیر کی ایک دوسری موسوم بہ ''تصویر محبت'' ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اس میں ایک تنبول فروش کے بیٹے رام چندر کی عشقیہ داستان کو بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی کے اشعار کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود فقیر کو تنبول فروش کے اس بیٹے سے عشق ہو گیا تھا۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

خدا وند دلی دہ شعلہ سانم   کہ از سوزش فتد آتش بجانم

فقیر کی مثنوی ''والہ و سلطان'' والہ داغستانی اور خدیجہ سلطان کے عشق کی رقت انگیز داستان کو بیان کرتی ہے۔ والہ کو اپنے عم زاد بہن سے عشق ہو گیا تھا۔ ایام طفلی میں ہی دونوں ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے تھے۔ لیکن بد قسمتی سے دونوں کی عروسی انجام پذیر نہیں ہو سکی۔ ناکام محبت کی اس داستان کو فقیر نے منظوم کیا ہے۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد تین ہزار دو سو تیس (۳۲۳۰) ہے۔ مثنوی کی خصوصیت کی بابت فقیر اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

ایں نظم ز نظمہای دیگر   از چند جہت بود نکوتر

اولی آنست کہ ایں حکایت   منقول نگشتہ از روایت

نبود چو حکایتی سماعی   یا ہمچو فسانہ اختراعی

تقویم کہ شدہ است اکنوں   شور فرہاد و عشق مجنون

آں بہ کہ رہ نرفتہ پویم   حرفی کہ بود نگفتہ پویم

لیلیٰ نہ بہ از خدیجہ سلطان   مجنون نہ بہ از علی قلی خاں

فقیر کی ایک مثنوی بعنوان ''شمس الضحیٰ'' عرفان و تصوف کے موضوع پر ہے۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

ای بہ نامت زبان سحر طراز   نطق را دادہ مایۂ اعجاز

اس مثنوی میں ائمہ دوازدہ کے کرامات و خارق العادہ کارناموں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطالب معتبر منابع سے اخذ کیے گئے ہیں۔ مثلاً ساتویں امام موسیٰ بن جعفر کی غیر معمولی فضیلتوں کی توصیف محمد بن علی بابو یہ کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ ابو جعفر محمد بن علی بابو یہ شیعوں کے بزرگ فقیہ تھے۔ یہ مثنوی ۱۱۷۳ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔ فقیر نے ایک مثنوی بعنوان ''مثنوی در

واقعۂ جان سوز کربلا''، لکھی تھی۔ اس مثنوی میں کربلا کے اندوہ ناک فاجعہ کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

سیر المتاخرین کے مصنف غلام حسین طباطبائی نے ایک مثنوی مسمی بہ ''بشارت الامامت''، لکھی تھی۔ اس مثنوی میں طباطبائی نے اپنے بزرگوں کے ماورائے طبیعی کرامتوں کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ مثنوی کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے:

بنام خدایکہ جان آفرید زمین آفرید و زمان آفرید

کتاب خانہ خدا بخش میں اس مثنوی کا قلمی نسخہ فہرست شمار ۱۹۹۱ کے تحت موجود ہے۔ یہ نسخہ ۶۹ - اوراق پہ محتوی ہے۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی شورش و سرکشی کی بابت ایک عیسائی بنام فراسو نے ایک مثنوی بعنوان فتح نامۂ انگریز لکھی تھی۔ مصنف اس وقت کے وقائع وحوادث کا چشم دید شاہد تھا۔ یہ مثنوی مخطوطہ کی صورت میں کتاب خانہ خدا بخش میں فہرست شمار ۱۹۴۹ کے تحت محفوظ ہے۔ مثنوی ایک سو پانچ اوراق پہ حاوی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

در نظم سفتم بنام خدای کریم و رحیم است وہم رہنمای

میر فرزند علی موزون کا وطن سامانہ تھا۔ فن شاعری میں میر شمس الدین فقیر کا تلمیذ تھا۔ وہ تیرہویں صدی ہجری کے اوایل میں اودھ کا ایک ذولسانین شاعر تھا۔ اس کے اشعار فارسی واردو دونوں زبانوں میں ملتے ہیں۔ بڑا کثیر الکلام اور شیریں گفتار شاعر تھا۔ اس کی وفات لکھنؤ میں ۱۲۲۹ھ میں ہوئی۔ اس نے ایک تاریخی مثنوی موسوم بہ ''آصف نامہ''، لکھی تھی۔ موزون نے اس مثنوی میں معرکہ جنگ مابین آصف الدولہ سربراہ مملکت اودھ اور غلام محمد خان سربراہ قوم روہیلہ کو منظوم کیا ہے۔ اس مثنوی کا قلمی نسخہ بخط مصنف پنچانوے صفحات پہ مشتمل کتاب خانہ خدا بخش کا مملوکہ ہے۔ جس کا سلسلہ وار نمبر ۲۶۷۱ ہے۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

بنام خداوند رب العباد کہ ملک سلیمان بہ آصف بداد

اور اس شعر پہ مثنوی انجام پذیر ہوتی ہے:

ز تیغش دل خصم او چاک باد سر دشمنش زیب فتراک باد

یہ مثنوی ۱۹۶۲ء میں ادارہ تحقیقات عربی وفارسی پٹنہ سے اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔

اورنگ زیب کے عہد کا معروف شاعر ملا بینش کشمیری بھی کئی مثنویوں کا مصنف ہے۔ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ''کلیات بینش'' کے قلمی نسخے میں بینش کی پانچ مثنویاں ہیں جبکہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کے کتاب خانہ میں جو مثنویات بینش کا نسخہ ہے اس میں چھ مثنویاں شامل ہیں۔اس مخطوطے کا فہرست نمبر ۱۰۹۴ ہے۔بینش کی مثنویوں کے نام اس طرح ہیں: بینش ابصار، گنج روان، گلدستۂ شور خیال، رشتۂ گوہر اور جواہر خانہ۔

بینش کشمیری کے مندرجہ بالا تمام مثنویوں میں ''شور خیال'' شعری محاسن کے اعتبار سے زیادہ درخور توجہ ہے۔ یہ مثنوی بنارس کی ایک عشقیہ داستان کو بیان کرتی ہے۔آغاز میں شہر بنارس کی خوشگوار فضا، وہاں کی دوشیزگان دلربا، فرح بخش مناظر و مظاہر کو منظوم کیا گیا ہے، پھر ایک مسلم نوجوان اور ایک ہندو دوشیزہ کی عشقیہ کہانی ہے جو ایک دن ساتھ غسل کرتے ہوئے دریا کے گرداب میں پھنس کر غرق ہو جاتے ہیں۔مثنوی کے ابتدائیہ چند اشعار اس طرح ہیں:

خداوندا ز شور دل خرابم نمک پرورده چو مرغ کبابم

بنارس را عجب آب و ہوا یست برای عشق بازی طرفه جایست

آرزو اکبرآبادی ایک مستند و محکم نثر نگار ہونے کے باوصف ایک مسلم الثبوت شاعر بھی تھے۔ان کی مثنوی ''جوش و خروش'' شہرت رکھتی ہے جو نوعی خبوشانی کی مثنوی ''سوز و گداز'' کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ان کی ایک دوسری مثنوی کا نام ''مہر و ماہ'' ہے۔ان کے علاوہ ایک مثنوی مسمیٰ بہ حسن و عشق زلالی کی مثنوی ''محمود و ایاز'' کے جواب میں لکھی گئی۔آرزو کی وفات ۱۱۶۹ھ میں ہوئی۔

کشمیر میں چک سلاطین کا عہد ہندوستان میں مغلیہ بادشاہوں کا ہم زمان رہا ہے۔۲۷ سال کی مدت سلطنت میں ناموافق سیاسی اوضاع کے باوجود اس دور میں فارسی شعر و ادب کو فروغ ہوتا رہا۔اس زمانے کے معروف شاعر شیخ یعقوب صرف نے نظامی گنجوی کی تقلید میں ''مسلک الاخیار''، ''وامق و عذرا''، مغازی النبی''، ''لیلیٰ مجنوں'' اور ''مقامات مرشد'' نام کی پانچ مثنویاں تصنیف کیں۔اکبر کے زمانے میں کشمیر سلطنت مغلیہ کا حصہ بن گیا۔مغلیہ دور میں فارسی شعر و ادب کی پیش رفت میں مزید تیزی آئی۔شیخ محمد چشتی نے تصوف کے موضوع پہ ایک مثنوی

''کنزالعشق''، لکھی تھی۔ میرزا کمال الدین بیگ خان کامل بدخشی نے ایک مثنوی بنام ''بحرالعرفان'' لکھی تھی جو چار جلدوں میں اسی ہزار اشعار پہ مشتمل ایک عارفانہ مثنوی ہے۔ افغانی دور کے کشمیری مثنوی نگاروں میں سعداللہ شاہ آبادی سب سے زیادہ معروف ہے۔ اس نے ''باغ سلیماں'' نام کی مثنوی میں حکام شہر کے جور وظلم کو بیان کیا ہے۔ ملا اشرف بلبل نے خمسہ تصنیف کیا ہے جو درج ذیل مثنویوں پہ مشتمل ہے۔ رضانامہ، ہشت اسرار، ہشت بہشت، مہر و ماہ اور ہیمال ناگرائے ہیمال و ناگرائے دو کشمیری عاشق و معشوق تھے۔ افغانی حکومت کے دور میں شیخ محمد رفیعی نے ''تحفۃ الاحباب'' اور ''مصابیح الدجا'' نام کی دو مثنویاں لکھی تھیں جن کے موضوعات پند و موعظت سے متعلق ہیں۔

سید محمد خورشید امامی بلگرامی پسر افتخار الدین ذرہ شہر آرہ کے مضافات میں واقع قصبہ کوات میں ۱۲۱۲ھ میں متولد ہوا تھا۔ امامی بلگرامی تیرہویں صدی ہجری کے نیمۂ اول میں ایالت بہار کا ایک مستند اور ارجمند شاعر محسوب ہوتا تھا۔ اس کی وفات ۱۲۷۴ھ میں ہوئی۔ امامی دو مثنویوں کا خالق ہے۔ اس کی پہلی مثنوی موسوم بہ ''شورش عشق'' ۱۲۲۳ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ یہ مثنوی تقریباً پانچ سو پچاس ابیات پر محتوی ہے۔ اس الم خیز و شورانگیز مثنوی کی اساس ادیب عرب اصمعی کی روایت کردہ ایک عاشقانہ داستان پر ہے۔ آغاز مثنوی میں امامی اشارہ کرتا ہے:

عرب را سحر سازی اصمعی نام فصاحت را ز نامش شہود در کام
بدیسان گفت حرفی غارت ہوش کز و در بحر اشکم غرق تا گوش

حمد، نعت اور منقبت کے بعد مثنوی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

بیا ای خامۂ شیرین زبانم بیا ای طوطیٔ ہندوستانم
ہوی ہند دوات خویش رو کن و زان سرچشمۂ معنی وضو کن

امامی سے قبل شیخ علی حزیں نے اس داستان کو منظوم کیا تھا جس کا ذکر شیخ کے ''تذکرۃ الاحوال'' میں موجود ہے۔ اختتامیہ کے اشعار بشرح ذیل ہیں:

چون این افسانہ آرد شورش عشق نہادم نام آن را شورش عشق
برایش گوہر تاریخ سفتم بود ملک در خوشاب گفتم

۱۲۹۲ھ میں یہ مثنوی مطبع نورالانوار (آرہ) سے اردو کے معروف شاعر صغیر بلگرامی کے تحت اہتمام اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔

امامی بلگرامی کی دوسری مثنوی بنام ''ثمر مراد'' ایک ہزار نو سو ابیات پر مشتمل ہے۔ امامی کا یہ ایک طربیہ منظومہ ہے جو ۱۲۴۸ھ میں انجام پذیر ہوا تھا۔ اس مثنوی کی تاریخ اتمام سے متعلق کئی شاعروں نے قطعات لکھے تھے۔ انور علی یاس آروی نے اس کی تاریخ تکمیل ''طاقت خامہ امامی'' اور ''باغ مراد'' جیسے کلمات سے نکالی ہے۔ مثنوی کا افتتاحیہ اس طرح ہے:

لوایم خامہ و لفظ است لشکر   بہ میدان آمدم اللہ اکبر
بدست طبع قوس زور بازو   خدنگ خامہ از کاغذ ترازو

اردو کے معروف شاعر صغیر بلگرامی اپنے تذکرہ موسوم بہ ''جلوہ خضر'' میں لکھتے ہیں کہ امامی کی مثنوی ''ثمر مراد'' کا مرتبہ غنیمت کنجاہی کے ''نیرنگ عشق'' سے بلند تر ہے، یہ مثنوی ۱۱۹۲ھ میں مطبع نورالانوار آرہ سے چھپ چکی ہے۔

راجہ پیارے لعل الفتی پسر رای سکھن لعل کایستھ فارسی کا ایک برجستہ صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت، پرورش و پرداخت عظیم آباد میں ہوئی تھی۔ سن شعور کو پہنچنے پر الفتی اکبر شاہ ثانی اور شاہ عالم کے ایام حکومت میں شاہجہاں آباد میں دیوانی کی خدمات پہ مامور تھا۔ دہلی کے ایام ملازمت کی مدت کو الفتی نے بڑے عزت و احترام کے ساتھ گزارا لیکن رمد چشم کی بیماری کے سبب اسے ملازمت ترک کر کے عظیم آباد لوٹنا پڑا، یہاں پچاس ہندو و مسلمان طلبا اس کے حلقہ تدریس میں داخل تھے۔ اس کے تلامذہ میں سب سے زیادہ شہرت وزیر علی عبرتی کو حاصل ہوئی۔ الفتی کا دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس نے ''نیرنگ تقدیر'' نام کی ایک مثنوی لکھی تھی جو اس وقت ارباب شعر و ادب کے درمیان بہت مقبول ہوئی تھی۔ یہ مثنوی ۱۲۹۸ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ الفتی کی وفات ۱۲۵۰ھ میں ہوئی تھی۔ ''نیرنگ تقدیر'' ایک عشقیہ مثنوی ہے جو تقریباً چھبیس سو ابیات پر محتوی ہے۔ مثنوی کی ابتدا حمد ایزد شعال سے اس طرح ہوتی ہے:

بیمار غمت نجوم افلاک   افتادہ بہ طاق چشم ادراک

نۂ چرخ بہ کنہ تو ز آغاز سرگشتہ چو گوی در تگ و تاز

ناخن بہ جگر ہلال از تو خواہندۂ ہر کمال از تو

یہ مثنوی خطہ باختر کے ایک امیر کی اکلوتی خوبرو دختر کی عشقیہ کہانی کو بیان کرتی ہے جس کا رشتہ مناکحت صغرسنی میں ہی قبیلہ کے ایک پسر نیکو چہر سے باندھ دیا گیا تھا۔ الفتی نے نیرنگ تقدیر کے علاوہ چند مختصر مثنویات بھی منظوم کی ہیں۔ مثلاً مثنوی موسوم بہ ''طلائی دست افشار'' جو ایک سو پچپن ابیات پہ حاوی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ کتاب خانہ خدا بخش میں فہرست نمبر ۳۶۱۰ کے تحت موجود ہے۔ الفتی نے اس مثنوی میں ایک تیز وطرار زن بیوی کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی نظامی کی ''مخزن الاسرار'' کے وزن میں منظوم ہوئی ہے، حمد باری تعالیٰ کے بعد مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے:

بیوہ زنی بود یکی تیز ہوش چابک و شیرین لبق ولہو کوش

برق نہ برقع ابر سیاہ در تتق ابر سیہ شرق ماہ

شوخ تر از نرگس سہشلای خویش در پی رسوائی شیدای خویش

الفتی کی ایک دوسری مختصر مثنوی بعنوان ''شکنج خرد'' احتراز صحبت بازنان کے موضوع پہ لکھی گئی ہے۔ اس میں عجم کے ایک بادشاہ کی داستان اور اس کے وزیر کے پند ونصیحت کو بیان کیا گیا ہے۔ چودہ صفحات پہ لکھی گئی مثنوی حمد ونعت کے بعد اس طرح شروع ہوتی ہے:

بد یکی از پادشاہان عجم صاحب خیل وخول ہم جنب جم

رفتہ از خود در ہوای چشم رگوش خوردہ از دست ہوس صہبای نوش

بستۂ زنجیر کاکل جان و دل در ہوای سر و نازی پا بہ گل

اس مثنوی کا قلمی نسخہ فہرست نمبر ۳۶۱۱ کے تحت کتاب خانہ خدا بخش میں موجود ہے۔ الفتی کی تیسری مختصر مثنوی مسمی بہ ''ابر'' ہے۔ یہ مثنوی ۱۵۲ ابیات پہ مشتمل ہے اور بارہ صفحات میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بعد حمد خالق ارض و سما گوییت نغزک مقال غم زدا

بود قاضی برسر دستار خوان ناگہانی بگذشت رند نوجوان

کتاب خدا بخش میں اس مثنوی کا مخطوطہ نسخہ فہرست نمبر ۳۶۱۲ کے تحت موجود ہے۔

شاہ امین احمد فردوسی متخلص بہ ثبات ۱۲۴۸ھ میں بہار شریف میں متولد ہوئے تھے۔ خوش فکر شاعر تھے اور عرفان وتصوف کے انوار واشراق کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی وفات ۷۲ سال کی عمر میں ۱۳۲۱ھ میں ہوئی۔ حضرت ثبات متعدد مثنویوں کے مصنف ہیں۔ ''گل فردوس'' ثبات کی طویل ترین مثنوی ہے۔ یہ مثنوی مطبع نول کشور سے ۱۳۰۱ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ حضرت ثبات نے اس مثنوی میں سلسلہ فردوسیہ کے اولیاء ومشائخ کی منقبتیں بیان کی ہیں۔ اشعار کی تعداد تقریباً پانچ ہزار ہے۔ مثنوی بحر رمل کے فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن کے وزن میں لکھی گئی ہے۔ ابتدائیہ شعر اس طرح ہے:

داند از معرفت آنکس کہ دل آگاہ بود　　　اینکہ در ارض وسماوات یک اللہ بود

شاہ ثبات کی دوسری مثنوی مسمی بہ ''گل بہشتی'' میں میر نجات اصفہانی کی مثنوی ''گل کشتی'' کے فنی اسلوب کی تقلید کی گئی ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے یہ مثنوی ''گل کشتی'' سے مختلف ہے۔ اس کا موضوع یکسر متصوفانہ ہے۔ یہ مثنوی بھی لکھنؤ کے مطبع انوار محمدی سے چھپ چکی ہے جو ۲۴۲ صفحات پہ حاوی ہے۔ اس مثنوی میں معروف و بلند مرتبت صوفیوں کے مدائح ومناقب بیان ہوئے ہیں۔ جن میں چند نام اس طرح ہیں، حضرت ابوالعلا، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی اور خواجہ فریدالدین گنج شکر وغیرہ۔ مثنوی کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے:

از ہمہ راہ رہِ فقر چہ دل خواہ بود　　　زانکہ الفقر اذا تم ہو اللہ بود

مثنوی میں اشعار کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔

شاہ ثبات کی مثنوی ''روضۃ النعیم'' کا سال طباعت ۱۳۰۱ھ ہے۔ یہ مثنوی مطبع اشرف الاخبار بہار شریف سے طبع ہوئی تھی۔ اس مثنوی میں بھی شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کے علاوہ چند دوسرے جلیل القدر صوفیہ کی خدمت میں منقبتیں پیش کی گئی ہیں۔ چند اشعار حضرت غوث الاعظم کی منقبت سے اس طرح ہیں:

حضرت شیخ جہاں سید عبد القادر　　　آنکہ انواع کرامات شد از وی صادر

از سوی ام علوی بود و حسینی بہ نسب　　　بود آمادہ پی تربیتش رحمت رب

شاہ ثبات کی ایک مثنوی ''شہد وشیر'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مثنوی ''نان و پنیر'' نام کی مثنوی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی نان و پنیر میں صوفیوں کی جماعت کی اہانت کی گئی تھی اور اہل تصوف کے افکار و اطوار کو مورد طنز و تضحیک قرار دیا گیا تھا۔ شاہ ثبات نے اس مثنوی کے ذریعہ صوفیہ کا دفاع کیا ہے اور مصنف نان و پنیر کا شافی اور دندان شکن جواب دلائل وشواہد کی روشنی میں دیا ہے۔ مثنوی کے چند اشعار اس طرح ہیں:

بوزنہ لذات ادرک کی شناخت　　شپرہ در روز روشن کی بتافت

صوفیان پاک را ذم می کنی　　نسبت ترپاک باسم می کنی

کاملی را ناقصی گر گفت بد　　باعث آن نیست جز بغض وحسد

عبدالجلیل بلگرامی کے فرزند میر محمد متخلص بہ شاعر ۱۱۰۱ھ میں متولد ہوئے تھے۔ بڑے زیرک و ذہین تھے اور فارسی کے مستعد و ہنرمند شاعر تھے۔ ان کی تصنیف کی ہوئی مثنوی موسوم بہ ''ناز و نیاز'' سید علی بلگرامی اور شاہ فیاض کی عاشقی کے موضوع پر ہے۔

میرزا اسداللہ خاں غالبؔ متوفی ۱۸۶۹ء شاعر دوزبانہ فارسی و اردو، فارسی غزل گوئی میں غیر معمولی قدرت واستعداد رکھنے کے باوصف ایک ہنرمد مثنوی سرا بھی تھے۔ وہ کئی مثنویوں کے خالق ہیں، مثلاً ''ابر گہر بار''، ''درد و داغ''، ''چراغ دیر'' اور مثنوی در بیان نموداری شان نبوت و ولایت کہ درحقیقت پرتو نورالانوار حضرت الوہیت است''۔ مثنوی ابر گہر بار کا موضوع غزوات سید المرسلینؐ ہے لیکن غالب اس مثنوی کو مکمل نہیں کر سکے تھے۔ فقط چند تمہیدی عنوانات کے تحت اس موضوع پر اشعار لکھے جا سکے تھے۔ ۱۸۶۴ء میں یہ مثنوی زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ اس ناتمام مثنوی کے باب معراج سید المرسلینؐ کے کچھ اشعار اس طرح ہیں:

شبی دیدہ روشن کن دلفروز　　ز اجزای خود سرمۂ چشم روز

در آن روز فرخندہ آنشب تخست　　ہمہ روز خود را بہ خورشید شست

شدہ چشم اعمیٰ در آن جوش نور　　تماشا گر حال اہل قبور

اس ناتمام مثنوی میں ۱۰۹۸ ابیات ہیں۔

غالب کی مثنوی موسوم بہ درد و داغ اس فکر پہ مبنی ہے کہ مقدر بشر میں جو چیز لکھی جا چکی ہے

وہ تغیر ناپذیر ہے۔ انسان ہزار ہاتھ پاؤں مارے، کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ مثنوی تین بدنصیب اشخاص کی ایک اندوہناک کہانی ہے۔ یہ ہیں ایک جوان دہقان اور اس کے ماں باپ۔ یہ مثنوی ۱۸۷ ابیات پہ مشتمل ہے۔ اس کا آغاز بقرار ذیل ہوتا ہے:

در دل صحرای جنون ریشہ داشت بی ثمری برزگری پیشہ داشت

زخم دل و داغ جگر دولتش دست تہی آئینہ قسمتش

پیر ہنش از جگرش چاکتر خانہ اش از دشت خطرناک تر

قضا و قدر نے اس الم نصیب خانوادے کی تقدیر میں مفلسی و محرومی لکھ دی تھی، اس لیے ایک فقیر روشن ضمیر کی دعاؤں کی برکت سے عیش و نشاط کی زندگی حاصل کر لینے کے باوجود اسے آخر الامر یہ راس نہیں آئی۔ غالب کی ایک مثنوی بعنوان ''در بیان نمو داری شان نبوت و ولایت کہ در حقیقت پرتو نور الانوار حضرت الوہیت است'' ہے۔ اس مثنوی کو غالب نے اپنے دوست مولانا فضل حق خیر آبادی کی فرمائش پہ لکھی تھی۔ اس کا موضوع حضرت خاتم النبیین محمدؐ کی نظیر کا امتناع ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مسائل بھی مثلاً رسول کریمؐ کے موئے مبارک کی حرمت، میلاد نبی کی محفلوں کا انعقاد وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ یہ مثنوی ایک سو اٹھائیس اشعار پہ محتوی ہے۔ دراصل مسلک اہل حدیث کے بعض خیالات کو رد کرنے کے مقصد سے مولانا خیر آبادی نے غالب سے یہ مثنوی لکھوائی تھی۔ امتناع نظیر رسول کریمؐ کی بابت مولانا اسماعیل شہیدؒ کی رائے یہ تھی کہ مثیل حضرت محمدؐ اس وجہ سے ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کی خاتمیت کے منافی ہے لیکن مولانا خیر آبادی کا نظریہ یہ تھا کہ مثیل رسول کریمؐ ممتنع بالذات ہے۔ غالب کی ایک اور مثنوی بعنوان ''چراغ دیر'' ایک سو نو اشعار میں منظوم ہوئی ہے۔ یہ ۱۸۲۶ء کے فروری، مارچ کے مہینوں میں منظوم ہوئی تھی۔ جب اثنائے مسافرت برائے کلکتہ غالب اسی سال جنوری کے اواخر میں بنارس پہنچے تھے۔ بنارس کے دل فریب مناظر نے ان کی طبیعت میں جذب و جنون کی کیفیت پیدا کر دی تھے۔ رود گنگ میں غسل کرتی ہوئی پری تمثال حسینوں کے جلوے، صبح و شام کی روح پرور فضا اور نہایت لطیف آب و ہوا سے غالب بے حد محظوظ و متمتع ہوئے تھے۔ چنانچہ ان نشاط انگیز کیفیتوں سے مغلوب ہو کر انہوں نے اس مثنوی کو منظوم کیا تھا۔ ''چراغ دیر'' کا اس طرح ہوتا ہے:

نفس با صور دمساز است امروز خموشی محشر راز است امروز
رگ سنگم شراری می نویسم کف خاکی غباری می نویسم

مثنوی کا خاتمہ درج ذیل صوفیانہ اشعار پہ ہوتا ہے:

ہوس را سر بہ بالین فضا نہ نفس را از دل آتش زیر پانہ
دل از تاب بلا بگداز وخون کن ز دانش کار نگشاید جنون کن
ز الاّ دم مزن تسلیم لا شو بگو اللہ و برق ما سوا شو

اقبال ابتدا میں اردو زبان میں شعر کہتے تھے لیکن جب ان کا اندیشہ وخیال وطنیت کے محدود دائرے سے نکل کر نوع انسان ، حیات و کائنات اور تمام عالم کے مظلوم ''انسانوں'' خصوصیت سے ایشیا کے باشندوں کی طرف مبذول ہوا اور اس کے سبب ان کے مطمح نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور مفاہیم وموضوعات میں عمق وابعاد کی افزونی ہوئی تو انہوں نے محسوس کیا کہ اردو زبان من حیث وسیلۂ اظہار ان کے لیے ناکافی اور ناقابل انحصار ہے۔لہٰذا اپنے بلند و بالیدہ افکار کے ابلاغ کے لیے انہوں نے فارسی زبان کو بروے کار لانا لازم سمجھا۔اقبال کہتے ہیں:

گر چہ ہندی در عذوبت شکراست طرز گفتار دری شیریں تراست
پارسی از رفعت اندیشہ ایم در خورد با فطرت اندیشہ ایم

اقبال اپنے افکار گراں مایہ کی ترسیل کے لیے غزل، رباعی، قطعہ کے علاوہ مثنوی کے قالب کو بھی بروے کار لائے۔انہوں نے پانچ مثنویاں نظم کی ہیں۔ان کی پہلی مثنوی ''اسرار خودی'' ہے۔اس مثنوی میں اقبال مولوی رومی کا ذکر ارادت وشوق صمیمانہ کے ساتھ کرتے ہیں اور اس کے بعد اس خواب کی تعبیر وتشریح کرتے ہیں جس میں انہیں رومی کے دیدار کا فیض حاصل ہوا تھا۔وہ اسی خواب کو اس مثنوی کا محرک قرار دیتے ہیں۔کہتے ہیں:

روی خود بنمود پیر حق سرشت کو بہ حرف پہلوی قران نوشت
گفت ای دیوانۂ ارباب عشق جرعہ ای گیر از شراب ناب عشق
آتش استی بزم عالم را فروز دیگران را علم ز سوز خود معبود

اسرار خودی رومی کی معروف بحر (رمل مسدس محذوف یا مقصور) میں لکھی گئی ہے۔

۱۹۱۵ء میں پہلی بار یہ مثنوی طبع ہوئی تھی۔ ذکر خودی پہ محتوی اشعار میں عظمت وقوت عشق کو بیان کیا گیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ خودو عشق کے تصورات کو اقبال نے رومی کے الہام بخش پیام سے اخذ کیا ہے۔ کہتے ہیں:

شمع خود را ہم چو رومی برفروز روم را در آتش تبریز سوز

''رموز بے خودی''، اسرار خودی'' کا ایک دوسرا بخش ہے۔ یہ مثنوی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھی، اقبال نے جس طرح خودی کو مخصوص معنی ومفہوم کے لیے استعمال کیا ہے، اسی طرح وہ بے خودی کی اصطلاح کو بھی نئی معنویت بخشتے ہیں۔ اس مثنوی میں بھی فکر رومی کی تاثیرات واضح ہیں۔ اقبال رومی کے اشعار کی تضمین بطور ذیل کرتے ہیں:

مرشد رومی چہ خوش فرمودہ است آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است
مگسل از ختم الرسل ایام خویش تکہ کم کن برفن و برگام خویش

اقبال نے اس مثنوی میں فرد وملت کے رابطے کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ وہ اس امر پہ تاکید کرتے ہیں کہ فرد ملت سے اور ملت فرد سے قوت حاصل کرتی ہے اور حیات بشر کو کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ جماعت سے اپنا رشتہ استوار کرتا ہے۔

''جاوید نامہ'' اقبال کی معروف ترین مثنوی ہے۔ یہ دراصل شاعر کی ایک خیالی سیر افلاک کا ماجرا ہے۔ یہ مثنوی انسان کی معراج کا ایک موثر ونہایت ہنرمندانہ انداز میں بیان کیا ہوا نمایش نامہ ہے جس میں اقبال نے فلسفۂ حیات کو تمثیل وتخیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کی نگارش کی محرک دانتے کا طربیہ الٰہی اور ابن عربی کی فتوحات مکیہ رہی ہیں۔ سیر افلاک میں ابتدا سے انتہا تک پیر رومی اقبال کی دستگیری کرتے ہیں اور افلاک میں ان کی ملاقات عظیم المرتبت وفات یافتہ شخصیتوں سے کراتے ہیں۔ رومی حقیقت کے جلووں کے دیدار کے لیے اقبال کو ورائے افلاک لے جاتے ہیں۔

اقبال رومی سے وجود وعدم کی حقیقت کی بابت سوال کرتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب میں رومی کی روح شعور وآگہی کے نکات ورموز کو نہایت دلنشین انداز میں بیان کرتی ہے۔ اقبال رومی سے اپنی قربت وصحبت اور حصول فیض وسعادت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

رومی آن عشق و محبت را دلیل تشنہ کامان را کلامش سلسبیل

پیر روم آن صاحب ذکر جمیل ضرب او را سطوت ضرب کلیم

مثنوی ''مسافر'' کو اقبال نے افغانستان کی مسافرت کے بعد نظم کیا تھا۔ اقبال کا یہ سفر ۲۱/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو افغانستان کے بادشاہ کی دعوت پہ ہوا تھا۔ یہ مثنوی ''خطاب بہ اقوام سرحد'' کے عنوان کے تحت نہایت مخلصانہ پند و موعظت کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہے۔ کہتے ہیں:

رزق از حق جو مجو از زید و عمر مستی از حق جو مجو از بنگ و خمر

دل بجو تا جاویدان باشی جوان از تجلی چہرہ ات چون ارغوان

اقبال کی آخری مثنوی ''پس چہ باید کرد ای اقوام شرق'' ہے۔ اقبال اس مثنوی میں استعماری حکومتوں کی سیاست اور ان کے طرز نظام کا مقایسہ حکومت الٰہی سے کرتے ہیں۔ تمہید میں پیر رومی کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں مشرق میں حیات نو کے آثار اسی دانائے راز کے افکار سے ظہور میں آئیں گے۔ چند اشعار اس طرح ہیں:

پیر رومی مرشد روشن ضمیر کاروان عشق و مستی را امیر

منزلش برتر ز ماہ و آفتاب خیمہ را از کہکشاں سازد طناب

نور قران درمیان سینہ اش جام جم شرمندہ از آئینہ اش

منابع و مآخذ

مجمع النفائس۔ سراج الدین علی خان آرزو۔ نسخۂ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۲۳۷۔

نشتر عشق۔ عاشقی عظیم آبادی۔ نسخۂ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۲۴۱۔

کلیات حسینی۔ میر محمد شریف الحسینی نسخۂ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۴۳۹۲۔

مثنوی در مکنون۔ شمس الدین فقیر۔ نسخۂ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۳۵۴۷۔

مثنوی بشارت العامت۔ غلام حسین طباطبائی۔ نسخۂ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۱۹۹۱۔

صحف ابراہیم (تذکرہ) ابراہیم خلیل۔ نسخۂ خطی خدا بخش۔ شمارہ ۲۲۸۔

تذکرہ ریاض الشعراء۔ والہ داغستانی۔ مطبوعہ۔ مرتبہ شریف حسین قاسمی، کتاب خانہ رضا رام پور۔

تذکرہ سفینۂ خوشگو۔ بندرابن داس خوشگو۔ مرتبہ۔ مرتبہ عطاء الرحمٰن کاکوی۔ پٹنہ۔

تذکرہ سفینہ ہندی۔ بھگوان داس ہندی۔ مطبوعہ۔ مرتبہ عطاء الرحمٰن کاکوی۔ پٹنہ۔
تذکرہ انیس الاحباء۔ موہن لعل انیس۔ مطبوعہ۔ مرتبہ پروفیسر سید انوار احمد۔ کتاب خانہ خدابخش پٹنہ۔
مثنوی ہدایت و بشارت۔ بوعلی قلندر پانی پتی۔ مطبوعہ۔ مرتبہ علی حیدر نیر۔ پٹنہ۔
مثنوی نیرنگ عشق۔ غنیمت کنجاہی۔ مطبوعہ۔ نول کشور۔
مثنوی ثمر مراد۔ امامی بلگرامی۔ مطبوعہ۔ مطبع نور الانوار آرہ۔ ۱۲۹۲ھ۔
مثنوی شورش عشق۔ امامی بلگرامی۔ مطبوعہ۔ مطبع نور الانوار آرہ۔ ۱۲۹۲ھ۔
مثنوی نیرنگ تقدیر۔ پیارے لعل الفتی۔ مطبوعہ۔ پٹنہ۔ ۱۲۹۸ھ۔
مثنوی نہ سپہر۔ امیر خسرو۔ مطبوعے۔ علی گڑہ۔
مثنوی قران السعدین۔ امیر خسرو۔ مطبوعہ۔ علی گڑہ۔
مثنوی دولرانی خضر خان۔ امیر خسرو۔ مطبوعہ۔ مرتبہ رشید احمد۔ علی گڑہ۔
مثنوی آصف نامہ۔ میر فرزند علی موزون۔ مطبوعہ۔ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی۔ پٹنہ۔
مثنوی والہ و سلطان۔ شمس الدین فقیر۔ مطبوعہ۔ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی۔ پٹنہ۔
مثنوی گل فردوس۔ شاہ امین احمد ثبات۔ مطبوعہ۔ نول کشور لکھنؤ۔
مثنوی گل بہشتی۔ شاہ امین احمد ثبات۔ مطبوعہ۔ انوار محمدی لکھنؤ۔
فہرست نسخہ ہای خطی کتاب خانہ ایوان ہند لندن
فہرست کتاب خانہ موزہ بریتانیا لندن
فہارس توضیحی (شعر فارسی) کتاب خانہ خدابخش۔
قند پارسی (فارسی مجلّہ) شمارہ (۱) ۱۹۹۰ء۔ اشاعت خانہ فرہنگ ایران دہلی نو۔
قند پارسی (فارسی مجلّہ) شمارہ (۱۲) ۱۲۷۹ش۔
فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۱۹۹۴ء۔
فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ زمنستان ۱۳۶۴۔
فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ پائیز ۱۳۸۴۔
فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۲۵-۲۴-۱۳۶۹۔
فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۵۲-۶-۷-۵-۷-۶۷-۶۶۔
فصل نامہ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۶۳-۶۲ اور ۷۷۔

بچے کی تعلیم وتربیت میں ولی کا کردار

پروفیسر نسیم محمود*

اسلام ولی کی زیرنگرانی افراد کی پرورش کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کے بھی اصول و ضوابط وضع کرتا ہے جن کے تحت نہ صرف بچوں کی پرورش بلکہ ان کے اخلاق و عادات کو بھی اعلی اوصاف سے مزین کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ان اعلیٰ اوصاف میں ان کی تعلیم وتربیت، حضانت کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد قرار دیا گیا ہے لہٰذا ذیل میں تفصیل کے ساتھ زیرحضانت افراد کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے ولی (Guardian) کے کردار کا ذکر کیا جاتا ہے۔

زیرحضانت افراد کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے درج ذیل اعتبارات سے بطور خاص بحث کی جاسکتی ہے:

۱-آداب کی تعلیم۔ ۲-مذہبی تعلیمات پرعمل کی ترغیب۔
۳-لکھائی پڑھائی کی تربیت۔ ۴-عمومی اور فنی تعلیم کا انتظام۔

والدین میں سے ایک کے پاس حضانت ہوتو پھر دوسرے کو اس بچے سے ملاقات و زیارت کی اجازت اور سہولت دی جاتی ہے تاکہ والدین مل کر ان کی تربیت کرسکیں۔والدین کی براہ راست نگرانی متوازی اور بھرپور پرورش کے لیے ضروری ہے۔یہ صورت مطلقہ خواتین کی اولاد کی ہے جبکہ یتیم بچوں کی حضانت میں ولی اس خلاء کو پر کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔زیرحضانت بچوں کی تعلیم وتربیت چونکہ ولایت کے بنیادی فرائض میں سے ہے لہٰذا اس حوالے سے کتاب وسنت اور فقہی مذاہب کی روشنی میں بحث کی جائے گی۔

کتاب وسنت: کتاب وسنت میں زیرحضانت بچوں کی تعلیم وتربیت کے باب میں اہم

---

* گورنمنٹ علامہ اقبال پوسٹ گریجویٹ کالج، سیالکوٹ۔

ضوابط کا ذکر حسب ذیل ہے:

۱- قرآن حکیم میں اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچانے کا حکم یوں دیا گیا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا(۱)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔

امام جصاص اور امام ابن العربی کے نزدیک اس سے مراد اہل وعیال کی تعلیم وتربیت کرنا ہے تاکہ وہ جہنم کی آگ سے محفوظ رہ سکیں۔(۲) امام جصاص کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

هذا يدل على أن علينا تعليم أولادنا وأهلينا الدين والخير و مالا يستغنى عنه من الادب ـ(۳)

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہمارے اوپر اپنی اولاد اور گھر والوں کی تعلیم، دین، بھلائی اور ضروری آداب سکھانا لازم ہے۔

۲۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی حدیث کے مطابق مرد وعورت اپنی اولاد کے نگران ہیں۔رسول اللہؐ کے الفاظ یہ ہیں:

والرجل راعٍ على اهل بيته وهومسئول عنهم والمرأة راعية على بيت بعلها وولده وهى مسئولة عنهم ـ(۴)

اور مرد اپنے گھر والوں پر نگران ہے اور وہ اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد پر نگران ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔

یعنی جس طرح مرد وعورت اپنی رعایا کی بہت سے امور میں نگرانی کرتے ہیں اسی طرح ان کی تعلیم وتربیت بھی ان کے ذمے ہے۔امام جصاص اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

فكذلك عليه تأديبه و تعليمه ـ(۵)

سو اسی طرح اس پر اس کی تعلیم وتربیت لازم ہے۔

۳- رسول اللہؐ نے سات سال کی عمر میں بچے کو نماز پڑھنے کا حکم دیا۔امام ابوداؤد کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

مروا الصبى بالصلوة إذا بلغ سبع سنين وإذا بلغ عشر

بچے کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو اور جب وہ دس سال کا ہو تو نماز کی ادائیگی

سنين فاضربوه عليها۔(٦) کے لیے اسے مارو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

وفرقوابينهم فی المضاجع ۔(۷) اور (دس سال کی عمر میں) ان کو بستروں سے جدا کردو۔

یہ حکم بھی ان کو آداب سکھانے کے لیے دیا گیا ہے۔

امام جصاص بچے کو نماز کے حکم پر مشتمل حدیث کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں:

فمن كان سنه سبعاً فهومأمور بالصلاة على وجه التعليم والتأديب۔(٨) سو جس کی عمر سات سال ہو اس کو تعلیم وتادیب کے طور پر نماز پڑھانے کا حکم دیا گیا ہے۔

۴- حضرت جابر بن سمرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لأن يؤدب الرجل ولده خير من يتصدق بصاع ۔(٩) یہ کہ باپ کا اپنے بیٹے کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

اس روایت کے مطابق اپنی اولاد کی اچھی تعلیم وتربیت صدقہ وخیرات سے بہتر قرار دی گئی ہے۔

۵- امام ترمذی ایک اور حدیث بیان کرتے ہیں جس میں والد کی طرف سے اولاد کے لیے بہترین تحفہ حسن ادب قرار دیا گیا ہے۔حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

مانحل والد ولدًا من نحل افضل من ادب حسن۔(١٠) کوئی والد اپنی اولاد کو اچھے ادب سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں دے سکتا۔

معلوم ہوا کہ کتاب وسنت کے مطابق اپنی اولاد کو تعلیم دلوانا، دین سکھانا، بھلائی کی باتیں اور ضروری آداب سکھانا والدین کی ذمہ داری ہے۔اس تعلیم وتربیت کو والدین کی طرف سے اولاد کے حق میں بہترین تحفہ اور صدقہ وخیرات سے بہتر عمل قرار دیا گیا ہے۔

فقہی مذاہب: آگے زیر حضانت افراد کی تعلیم وتربیت کو فقہی مذاہب کی روشنی میں بیان کیا جائے گا۔

احناف: احناف کے نزدیک زیر حضانت افراد کی تعلیم و تربیت کے باب میں ولی کے کردار کے ضوابط حسب ذیل ہیں:

۱۔خواتین ابتدائی عمر میں بچوں کی تربیت کے لیے زیادہ موزوں اور مناسب ہیں۔امام کاسانی کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

والأصل فيها النساء لأنهن	اور حضانت میں اصل حق خواتین کا ہے
اشفق وارفق واهدى إلى تربية	کیونکہ وہ زیادہ شفیق، رحم دل اور بچوں کی
الصغار ۔(۱۱)	تربیت کے لیے ہدایت یافتہ ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو ابتدائی عمر میں خواتین کی تربیت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔اس لیے ان کو حضانت کا زیادہ حق دار قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ بچی بلوغت تک ماں کی حضانت میں رہے گی تاکہ خواتین کے آداب واخلاق اور گھر کی خدمت کی تعلیم دی جا سکے۔امام کاسانی کے الفاظ یہ ہیں:

و هذا المعنىٰ لا يوجد فى	اور یہ معنی بچی میں نہیں پایا جاتا سو اس کو ماں
الجارية تترك فى يد الام بل	کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا بلکہ اسے
تمس الحاجة الى الترك فى	خواتین کے آداب، ان کے اخلاق اپنانے
يدها إلى وقت البلوغ لحاجتها	اور گھر کی خدمت کی تعلیم کی حاجت کے
إلى تعليم آداب النساء والتخلق	سبب بلوغت تک ماں کے پاس چھوڑنے
بأخلاقهن وخدمة البيت۔(۱۲)	کی ضرورت ہوتی ہے۔

سو بچیوں کو خواتین کے آداب واخلاق اور گھر کی خدمت سکھانا ان کی تربیت کا لازمی حصہ ہے اور یہ تربیت خواتین ہی بہتر انجام دے سکتی ہیں۔

۳۔ جب بچہ خود کھانے پینے کی عمر (سات سال) کو پہنچ جائے تو اسے آدمیوں کے اخلاق وآداب سیکھنے اور علم حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔امام مرغینانی اور امام کاسانی نے اس کو بیان کیا ہے۔(۱۳) امام کاسانی کے الفاظ یہ ہیں:

لأن الغلام إذا استغنى يحتاج	کیونکہ بچہ جب (کھانے، پینے اور پہننے

إلى التاديب والتخلق بأخلاق الرجال وتحصيل أنواع الفضائل واكتساب اسباب العلوم والاب على ذلك أقوم واقدر ۔(۱۴)	سے) مستغنی ہو جائے تو وہ ادب سکھانے، آدمیوں کے اخلاق، مختلف اقسام کے فضائل اخلاق کے حاصل کرنے اور علوم کے اسباب کے حصول کی ضرورت مند ہوتا ہے اور باپ اس پر زیادہ قادر ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ سات سال کے بعد بچے کو آدمیوں کے اخلاق اور علوم کے اسباب (تعلیم کے بنیادی امور) سکھانا باپ کی ذمہ داری ہے۔

۴۔ باپ زیر حضانت بچوں کو تجارتی، صنعتی اور فنی علوم سکھانے کے لیے ان سے اجارہ کرواسکتے ہیں۔امام جصاص کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

وان يؤاجره ممن يعلمه الصناعات والتجارات ونحوها لأن جميع ذلك قديقع على وجه الاصلاح ۔(۱۵)	اور یہ کہ وہ اس (زیر حضانت بچے) سے ایسا اجارہ کروائے جس سے وہ صنعت اور تجارت وغیرہ کو جان سکے کیونکہ یہ تمام امور اصلاح کے لیے ہوتے ہیں۔

امام کاسانی بچے کو ہنر سکھانے کے حوالے سے فرماتے ہیں:

إن فى إيجاره فى الصنائع من باب التهذيب والتاديب والرياضة ۔(۱٦)	بلاشبہ فن اور کاریگری کے کام میں بچے کو اجارہ کروانا اسے مہذب بنانے، اس کی تربیت کرنے اور جسمانی ورزش کے باب میں سے ہے۔

سو آج کے دور میں بچے کی ذات کا اجارہ مختلف انواع کی ٹیکنیکل اور فنی مہارت کے حصول کے لیے ضروری ہے۔

شوافع: شوافع کے نزدیک زیر حضانت افراد کی تعلیم وتربیت کے باب میں ولی کے کردار کے ضابطے حسب ذیل ہیں:

۱۔ بچہ ماں کو اختیار کرے تو ماں، باپ کو اس کی تادیب سے نہیں روک سکتی۔امام شافعی

کے الفاظ یہ ہیں:

فإن إختار أمه فعلى أبيه نفقته و لا تمنع من تاديبه ۔(۱۷)	سو اگر وہ اپنی ماں کو اختیار کرے تو اس کے باپ پر نفقہ لازم ہے اور وہ اس کے باپ کو اس کی تادیب سے منع نہیں کرے گی۔

امام شافعی اس کی مزید وضاحت یوں کرتے ہیں:

ويخرج الغلام إلى الكتاب والصناعة إن كان من أهلها ويأوى عندامه ۔(۱۸)	اور وہ (باپ) بچے کو کتابت اور کاریگری سکھانے کے لیے لے کر جائے گا، اگر وہ اس کا اہل ہو اور وہ اپنی ماں کے پاس رہے گا۔

امام نووی ولی پر زیر حضانت بچے کی تعلیم و تادیب کو واجب قرار دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

تاديبه وتعليمه واجب على وليه اباً كان أو جدًا أو وصيًا أو قيمًا ۔(۱۹)	اس کی تادیب اور تعلیم اس کے ولی پر واجب ہے خواہ وہ باپ ہو یا دادا یا وصی یا منتظم۔

مختصراً یہ کہ بچے کے ماں کو اختیار کرنے کی صورت میں بھی باپ پر بچے کی تعلیم و تربیت لازم ہے۔

۲۔ اگر بچہ اپنے باپ کو اختیار کرے تو باپ اسے اس کی ماں کی زیارت سے منع نہیں کر سکتا۔ امام شافعی کے الفاظ یہ ہیں:

وإن أختار أباه لم يكن لأبيه منعه من أن ياتى أمه وتاتيه فى الايام ۔(۲۰)	اور اگر بچہ اپنے باپ کو اختیار کرے تو اس کے باپ کے لیے اس کو اپنی ماں کے پاس آنے سے منع کرنا جائز نہیں اور اس کی ماں اس کے پاس دن کے اوقات میں آئے گی۔

امام شیرازی اس کی وجہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

لأن المنع من ذلك إغراء	کیونکہ اس سے منع کرنا نافرمانی اور رشتہ داری

بالعقوق وقطع الرحم فإن	کو ختم کرنے پر ابھارنا ہے تو اگر وہ بیمار ہو
مرض كانت الأم أحق	جائے تو ماں اس کی عیادت کرنے کی زیادہ
بتمريضه ۔(۲۱)	حق دار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچہ ماں سے ملاقات کر سکتا ہے اور ماں اس سے ملاقات کر سکتی ہے تا کہ ماں کی شفقت بھی میسر آ سکے۔

۳۔اگر بچی ہو تو اس کی ماں کو اس کے پاس آنے سے منع نہیں کیا جائے گا اور اگر ماں بیمار ہو تو بچی عیادت کے لیے جائے گی۔امام شافعی فرماتے ہیں:

و إن كانت جارية لم تمنع	اور اگر بچی ہو تو اس کی ماں کو اس کے پاس
أمها من أن تاتيها ولا أعلم	آنے سے منع نہ کیا جائے اور میں اس کے
على أبيها إخراجها اليها	باپ پر بچی کو اس کی ماں کے پاس لے
إلا من مرض فيؤمر بإخراجها	جانے کا علم نہیں رکھتا سوائے بیماری کے کہ
عائدة ۔(۲۲)	ماں کی عیادت کے لیے اسے وہاں لے
	جانے کا حکم دیا جائے گا۔

۴۔امام ماوردی کے مطابق اگر بچی اپنی ماں کو اختیار کرے تو رات دن بچی کی حق دار ہے کیونکہ بچی حیادار ہوتی ہے۔سو اس کا باہر نکلنا منع ہے تا کہ اس کی حفاظت ہو سکے اور اس کے باپ کے لیے اس کی زیارت جائز ہے تا کہ آپس میں الفت و محبت قائم ہو۔ملاقات کے وقت زیادہ دیر نہیں ٹھہرے گا مگر زیارت کے وقت محرم مرد یا ثقہ خواتین ہوں تا کہ طلاق ہونے کے بعد خلوت کے شک کی نفی ہو سکے۔(۲۳)

بچی کے لیے دونوں صورتوں میں والدین کی ملاقات کی اجازت سے ان کی بہتر تربیت مقصود ہے۔

حنابلہ: حنابلہ کے نزدیک زیر حضانت افراد کے لیے تعلیم و تربیت کے باب میں ولایت کے کردار کے ضوابط حسب ذیل ہیں:

ا۔بچی کو کاتنے اور پکانے کی گھر میں تعلیم کا اہتمام کیا جائے گا۔امام ابن قدامہ کے

الفاظ یہ ہیں:

إذا كانت الجارية عند الأم أو عند الأب فإنها تكون عنده ليلاً ونهارًا لأن تاديبها و تخريجها في جوف البيت من تعليمها الغزل والطبخ وغيرها ولا حاجة بها الى الاخراج منه ۔(۲۴)	جب بچی ماں یا باپ کے پاس ہوتو وہ اس کے پاس دن رات رہے گی کیونکہ اس کو ادب سکھانا اور ٹریننگ دینا گھر کے اندر ہوتا ہے جیسے کاتنا، پکانا وغیرہ اور اس کے لیے اسے گھر سے باہر لے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچی گھر کے امور میں مہارت حاصل کرے گی۔ اس ضمن میں وہ بطور خاص سینے اور باورچی خانہ کی ذمہ داریوں کے متعلقہ علوم حاصل کرے تا کہ وہ عملی زندگی میں کامیاب ہو سکے۔

۲۔ والدین میں سے کسی ایک کے پاس بچی ہو تو دوسرے کو زیارت سے منع نہیں کیا جائے گا۔ امام ابن قدامہ کے الفاظ یہ ہیں:

ولايمنع أحد هما من زيارتها عند الاخر من غير أن يخلو الزوج بامها ولا يطيل ۔(۲۵)	اور ان دونوں میں سے ایک دوسرے کو اس بچی کی زیارت سے منع نہیں کرے گی بغیر اس کے کہ خاوند اس کی ماں کے ساتھ خلوت (علاحدگی اور تنہائی) میں نہ رہے اور نہ وہ زیادہ دیر قیام کرے۔

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

و إن مرضت فالام أحق بتمريضها في بيتها ۔(۲۶)	اور اگر وہ بیمار ہو جائے تو ماں اس کے گھر میں اس کی تیمارداری کی زیادہ حق دار ہے۔

ان عبارتوں سے حسب ذیل ضابطے ثابت ہوئے:

۱- والدین میں سے ایک کو دوسرے کے لیے اولاد کو دیکھنے کی اجازت۔

۲- خاوند کا اپنی مطلقہ بیوی کے ساتھ تنہائی سے اجتناب۔

۳- خاوند کے لیے اس کے ہاں طویل قیام کی ممانعت۔
۴- بچہ بیمار ہو تو ماں تیمارداری کی زیادہ حق دار۔

۳۔ بچہ سات سال کے بعد اپنے اختیار کے ساتھ ماں کے پاس ہو تو ماں کے پاس رات کے وقت ہوگا اور دن کے وقت باپ مدرسے یا کارخانے میں لے جائے گا۔ امام ابن قدامہ کے الفاظ یہ ہیں:

كان عندها ليلاً ويأخذه الأب	وہ بچہ اس (ماں) کے پاس رات کو ہوگا
نهارًا ليسلمه في مكتب أوفي	اور باپ دن کے وقت اسے لے گا تاکہ
صناعة ۔(۲۷)	اسے مدرسے یا انڈسٹری میں چھوڑ سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچہ ماں کے پاس ہو تو باپ اس کی عمومی تعلیم یا فنی تعلیم کا انتظام کرے گا۔

۴۔ اگر بچہ سات سال کے بعد باپ کے پاس ہو تو دن رات اس کے پاس رہے گا مگر اسے ماں کے پاس آنے جانے سے نہیں روکے گا۔ المغنی میں ہے:

ولايمنع من زيارة أمه لأن	اور وہ (باپ) اس کو اپنی ماں کی زیارت
منعه من ذلك إغراء بالعقوق	سے نہیں روکے گا کیونکہ اس کا منع کرنا
وقطعية الرحم وإن مرض	نافرمانی اور رشتہ داری ختم کرنے پر ابھارنا
كانت الأم أحق بتمريضه فى	ہے اور اگر بیمار ہو تو ماں اپنے گھر میں اس
بيتها ۔(۲۸)	کی تیمارداری کی زیادہ حق دار ہے۔

۵۔ والدین میں سے کسی ایک کے بیمار ہونے یا وفات پانے پر آنے سے بچی اور بچے کو روکا نہیں جائے گا۔ المغنی میں ہے:

وإن مرض أحد الأبوين عند	اور اگر والدین میں سے کوئی بیمار ہو جائے اور بچہ
الاخر لم يمنع من عيادته	دوسرے کے پاس ہو تو اس کو عیادت سے منع نہیں
وحضوره عند موته سواء كان	کیا جائے گا اور اس کی موت کے وقت حاضر ہونے
ذكرًا أوانثى ۔(۲۹)	سے بھی منع نہیں کیا جائے گا خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔

ان مسائل سے درج ذیل امور ثابت ہوئے:

۱- سرپرستوں کے لیے بچے اور بچی کی تعلیم اور فنی مہارت کا اہتمام۔

۲- والدین سے ملاقات کا انتظام۔

مالکیہ: مالکیہ کے نزدیک زیر حضانت بچوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے ولی کا کردار حسب ذیل ہے:

۱۔ بچہ ماں کی حضانت میں ہو تو باپ دن کے وقت تادیب وتعلیم کا انتظام کرے گا۔ امام سحنون فرماتے ہیں:

قال مالك يؤدبه بالنهار	امام مالک نے فرمایا وہ دن کے وقت اس کو ادب
ويبعثه إلى الكتاب وينقلب	سکھائے اور اس کو کاتبوں کے پاس بھیجے اور وہ
إلى أمه بالليل فى حضانتها	رات کو ماں کی حضانت میں چلا جائے اور وہ
ويؤدبه عندامه ۔(۳۰)	اس کو اس کی ماں کے پاس ادب سکھائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچہ ماں کی حضانت میں ہو تو باپ دن کے وقت اس کی تربیت کا اہتمام کرے اور زیر ولایت بچوں کی تعلیم وتربیت اور پرورش کے اخراجات کا ذمہ دار بھی باپ ہی ہے۔ اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو جن کی سرپرستی میں بچہ ہے ان پر حضانت کے اخراجات لازم ہوں گے۔

بچوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے اس بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ کتاب وسنت میں بچوں کی تعلیم وتربیت کو والدین پر لازم قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ مذاہب اربعہ کے مطابق بچوں کی تربیت، مردوں کے آداب کی تعلیم، کتابت کی مشق نیز تجارت، صنعت وغیرہ فنی تعلیم زیر ولایت افراد کو دلانا سرپرستوں کے فرائض میں ہے۔

۳۔ بچیوں کی تربیت، خواتین کے آداب نیز ان کو گھریلو امور جیسے کاتنے اور پکانے کی مہارت سکھانا بھی سرپرستوں پر لازم ہے۔

۴۔ والدین میں اگر علاحدگی ہوگئی ہے اور ان میں کسی ایک کے پاس بچہ یا بچی ہو تو دوسرے کو اس سے ملاقات کی اجازت ہوگی تاکہ ممکنہ حد تک بچے کی بہتر تربیت ممکن ہو۔

مروجہ قوانین: زیر حضانت بچوں کی تعلیم وتربیت کا گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ میں یوں ذکر ہے:

And must look to his support, health and

education. (۳۱)

اور ولی (اپنے زیر حضانت بچے کی) مدد، صحت اور تعلیم کا ضرور خیال رکھے۔

عدالتی فیصلہ جات: عدالتی فیصلوں میں بھی حضانت کے حق کا فیصلہ بچوں کی بہبود کے حوالے سے ہوتا ہے اور ان کی بہبود میں بنیادی اہمیت ان کی تعلیم و تربیت کو حاصل ہوتی ہے۔ اس حوالے سے بعض فیصلوں حسب ذیل ہیں:

۱۔ مسز روبیہ گیلانی بنام ظہور اختر راجہ کیس سپریم کورٹ آف پاکستان میں جسٹس اجمل میاں، جسٹس منور احمد مرزا اور جسٹس چوہدری محمد عارف کی عدالت میں پیش ہوا۔ ان کے تینوں بچے (عمر، حارث، خالد) نو سال سے زائد عمر کے تھے اور باپ کی حضانت میں تھے مگر لارنس کالج مری میں بچوں کی تعلیم کے سبب اپنی والدہ سے دور تھے۔ اس لیے ماں سے ملاقات ممکن نہ تھی لہٰذا ماں کے لیے حضانت کا مطالبہ کیا گیا مگر فاضل عدالت نے اچھی تعلیمی سہولتوں کے سبب باپ کے حق میں حضانت کا فیصلہ کیا۔ اس کا ذکر فیصلے میں یوں ہے:

Thus, considering the broad details of the present case and background of circumstances we have no doubt that respondent by educating the children at Lawrence College Murree is providing them proper educational facilities, therefore, it would not be fair to disturb the right of respondent regarding their custody.(۳۲)

یوں موجودہ کیس اور حالات کے پس منظر کی مکمل تفصیلات پر غور کرتے ہوئے ہمیں کوئی شک نہیں ہے کہ مدعا علیہ کے ذریعے بچوں کو لارنس کالج مری میں تعلیم دلانا مناسب تعلیمی سہولتیں مہیا کرنا ہے۔ اس لیے مدعا علیہ کے حق میں حضانت کے اعتبار سے خلل ڈالنا مناسب نہیں ہے۔

اس فیصلے میں بنیاد ان بچوں کی بہتر تعلیم کو قرار دیا گیا ہے۔

اس فیصلے میں بچے کے کردار کی تکمیل کا ذکر یوں کیا:

However, we simultaneously feel that character of the child is not fully developed in the absence of maternal affection. (۳۳)

تاہم بیک وقت محسوس کرتے ہیں کہ ماں کی محبت وشفقت کے بغیر بچے کے کردار کو مکمل طور پر پروان نہیں چڑھایا جاسکتا۔

اس لیے عدالت نے ان بچوں سے ماں کی ملاقات کا حسب ذیل معمول وضع کیا۔

ا= بچے موسم گرما اور سرما کی تعطیلات کے دوران لاہور میں اپنی والدہ کے ساتھ رہیں گے۔

ب= ماں کالج کے پرنسپل سے اجازت لے کر مہینے میں ایک بار کالج میں بچوں سے ملاقات کرسکے گی۔

۲۔ مسز اسلم خاتون بنام محمد منیر کیس لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس سید نجم الحسن کاظمی کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس میں نو سالہ بچے اور آٹھ سالہ بچی کی حضانت کا معاملہ تھا۔ دونوں بچے لاثانی کیڈٹ پبلک سکول میں پڑھ رہے تھے۔ مناسب تعلیم اور اچھی صحت کے سبب ماں کو حضانت کا حق دیا گیا۔ اور باپ کے لیے ہر مہینے کے پہلے اور آخری سوموار عدالتی حدود اور عدالتی اوقات کے دوران بچوں سے ملاقات کی اجازت دی گئی۔ (۳۴)

۳۔ مسز نسیم کوثر بنام سلیم وغیرہ کیس لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس عبدالشکور پراچہ کی عدالت میں پیش ہوا، یہ محمد عاقب سلیم کی حضانت کا کیس تھا۔ اس فیصلے میں ماں کو حضانت کا حق دار قرار دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ باپ کی نسبت ماں زیادہ بچے کی بہبود کی دیکھ بھال کرسکتی ہے کیونکہ باپ سپئیر پارٹس کی دوکان پر زیادہ وقت صرف کرنے کے سبب اسے زیادہ وقت نہیں دے سکے گا۔ یوں بچے کو تمام وقت سوتیلی ماں کے پاس گزارنا پڑے گا۔ عدالت نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ سرپرست جج باپ کی اپنے بچے کے ساتھ ملاقات کا پندرہ روزہ معمول بنائے گا اور اس کے علاوہ عید کی تعطیلات، موسم گرما اور موسم سرما کی تعطیلات کے دوران بھی ملاقات کا انتظام کرے گا۔ (۳۵)

ان عدالتی فیصلوں سے معلوم ہوا کہ:

ا- حق حضانت کے لیے بہتر تعلیم وتربیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور عام طور پر اسی

بنا پر حضانت کا فیصلہ ہوتا ہے کیونکہ یہ حضانت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

۲- والدین میں سے کسی ایک کے پاس حضانت ہوتو دوسرے کو اس بچے سے ملاقات کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ بچے کو ماں باپ کی محبت وشفقت کے ساتھ ساتھ تحفظ کا احساس بھی حاصل ہو اور یوں ان کے کردار کی ممکنہ حد تک تکمیل ہو سکے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ کتاب وسنت، مذاہب اربعہ اور مروجہ قوانین کے مطابق زیر ولایت افراد کی بہتر تعلیم وتربیت سرپرستوں پر لازم ہے۔ عدالتی فیصلہ جات میں بھی بچوں کی بہتر تعلیم وتربیت کو حضانت کے استحقاق کے لیے اہم حیثیت حاصل ہوتی ہے نیز عدالتی فیصلہ جات میں والدین میں سے کسی ایک کے پاس حضانت کی صورت میں دوسرے کے لیے ملاقات کے باقاعدہ پروگرام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام: ۱- کتاب وسنت کے مطابق بچوں کی تعلیم وتربیت والدین پر لازم ہے۔ مذاہب اربعہ کے مطابق بچوں کی تربیت، مردوں کے آداب، کتابت کی ٹریننگ نیز تجارت، صنعت جیسی فنی تعلیم سرپرستوں پر لازم ہے۔

۲- بچیوں کی تربیت، خواتین کے آداب نیز امور خانہ داری کی مہارت سکھانا بھی سرپرستوں کا فرض ہے۔

۳- طلاق یافتہ والدین میں سے کسی ایک کے پاس بچہ یا بچی ہوتو دوسرے کو اس سے ملاقات کی اجازت ہوگی تاکہ بچے کی بہتر تربیت ممکن ہو۔

۴- مروجہ قوانین میں بھی زیر حضانت افراد کی تعلیم سرپرستوں کے فرائض میں سے ہے نیز عدالتی فیصلوں میں بھی بچوں کی تعلیم وتربیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں والدین میں سے کسی ایک کے پاس حضانت ہوتو دوسرے کو بچوں سے ملاقات کے باقاعدہ شیڈول کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ ان کی تربیت کی تکمیل ہو سکے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) التحریم، (۶۶)/۶۔ (۲) جصاص، ابوبکر احمد بن علی رازی، (م ۳۷۰ھ)، احکام القرآن، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۳/۶۹۷؛ ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ، (م ۵۴۳ھ)، احکام القرآن، دار احیاء التراث العربی،

بیروت، لبنان، ۲۷۵/۴۔ (۳) جصاص، احکام القرآن، ۶۹۷/۳۔ (۴) مسلم بن حجاج قشیری، (م ۲۶۱ھ)، الجامع الصحیح، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامیر العادل وعقوبۃ الجائر والحث علی المرفق بالرعیۃ، قدیمی کتب خانہ کراچی، طبع دوم، ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء، ۱۲۲/۲۔ (۵) جصاص، احکام القرآن، ۶۹۷/۳۔ (۶) ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، (م ۲۷۵ھ)، السنن، کتاب الصلوٰۃ، باب متی یؤمر الغلام بالصلوۃ، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۷۷/۱۔ (۷) ایضاً ۷۸۔۷۷۔ (۸) جصاص، احکام القرآن، ۵۵۲/۱۔ (۹) ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، (م ۲۷۹ھ)، الجامع، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی ادب الولد، اسلامی کتب خانہ، دیوبند، بھارت، ۱۹۸۵ء، ۱۶/۲۔ (۱۰) ایضاً۔ (۱۱) کاسانی، علاء الدین ابوبکر بن مسعود، (م ۵۸۷ھ)، بدائع الصنائع، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، ۴۵۶/۳۔ (۱۲) ایضاً ۴۵۹/۳۔ (۱۳) مرغینانی علی بن ابی بکر (م ۵۹۳ھ)، الھدایۃ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۴۴۰/۲؛ کاسانی، بدائع الصنائع، ۴۵۹/۳۔ (۱۴) کاسانی، بدائع الصنائع، ۴۵۹/۳ (۱۵) جصاص، احکام القرآن، ۴۵۲/۲ (۱۶) کاسانی، بدائع الصنائع، ۲۱/۴ (۱۷) شافعی، محمد بن ادریس، (م ۲۰۴ھ)، الام، داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء، ۳۰۱/۶۔ (۱۸) ایضاً ۳۰۴۔ (۱۹) نووی، ابوزکریا یحییٰ بن شرف، (م ۶۷۶ھ)، روضۃ الطالبین، دارالکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء، ۵۱۱/۶۔ (۲۰) شافعی، کتاب الام، ۳۰۴/۶۔ (۲۱) شیرازی، ابواسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف (۳۹۳ھ۔ ۴۷۶ھ)، المھذب، تحقیق: دکتور محمد الزحیلی، الدار الشامیۃ، بیروت، لبنان، الطبعۃ الاولی، ۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۶م، ۶۵۰/۴۔ (۲۲) شافعی، کتاب الام، ۳۰۴/۶ (۲۳) ماوردی، ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب بصری، (م ۴۵۰ھ)، کتاب النفقات، دارابن حزم/۲۷۰ (۲۴) ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ، (م ۶۲۰ھ)، المغنی، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۴ء، ۴۱۳/۷۔ (۲۵) ایضاً۔ (۲۶) ایضاً، المغنی، ۴۱۳/۷۔ (۲۷) ایضاً۔ (۲۸) ایضاً۔ (۲۹) ایضاً۔ (۳۰) سحنون، عبدالسلام بن حبیب تنوخی، (م ۲۴۰ھ)، المدونۃ الکبریٰ، دارالفکر، بیروت، لبنان، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء، ۱۰۵۲/۳۔

31.Saghir Ahmad, *Guradians and wards Act*, 1890, Mansoor Book House, Lahore / 9532

32. Abdul Halim, Sheikh, *The Supreme Court Monthly Review(S.C.M.R.)*, Church Road, Lahore. Edi.1999.p:1836.

33.1999, *S.C.M.R.*, 1836

34.Malik Muhammad Saeed, *The Monthly Law Digest (M.L.D.)*, 35-Nabha Road,Lahore Edi.2000,p:1216

35. M.A Zafar, *Shariat Law Reports(S.L.R.)*, Justice Jameel Hussain Rizvi Road, Lahore, Edi.2004,p:40

استدراک
''تصوف کیا ہے''

مولانا ہلال احمد قادری

معارف ماہ جنوری/فروری ۲۰۱۲ء کے شمارے میں پروفیسر الطاف احمد اعظمی کا مضمون ''تصوف کیا ہے'' نظر سے گذرا، معارف میں اس معیار کی تحریر کی اشاعت باعث حیرت ہوئی، شاید مضمون نگار کے اصرار نے مدیران معارف کو اس کی اشاعت پر مجبور کیا، مخالف کی تحریر کو شائع کرنا یقیناً اعلیٰ ظرفی ہے، مگر اس طرح مخالف کو سلف صالحین پر دشنام طرازی کا موقع بھی دینا ہے، بقول مضمون نگار ''حق کے اظہار و اشاعت سے گریز معارف کی قدیم روایات کے خلاف ہے'' بات تو صحیح ہے مگر سلف صالحین کی تضلیل وتوہین کب معارف کی قدیم روایات میں شامل رہی ہے؟

دونوں قسطوں کی تحریر پڑھنے سے عام تاثر یہ ملتا ہے کہ ملت اسلامیہ کی چودہ سوسالہ تاریخ میں ہدایت کی راہ محفوظ نہیں رہی ہے، اور مسلمانوں کا سواد اعظم شرک و گمرہی میں مبتلا رہا ہے، اپنے فہم پر ہی اعتماد، سلف صالحین سے بے اعتمادی، خود کو ہی دین حق کا حامل سمجھنا، علماء اور مشائخ کو دین سے بے بہرہ اور گمراہ سمجھنا روافض و خوارج کا نظریہ رہا ہے۔ اسی نظریے کی اشاعت تصوف اور اہل تصوف کے خلاف زور و شور سے کی جارہی ہے، مذکورہ مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مقالہ نگار نے تصوف اور اہل تصوف کا رد و ابطال کرنے میں علمائے اہل تصوف کی توجیہات و تاویلات بھی نقل کی ہیں، لیکن ان توجیہات کو قابل قبول ہونے کے باوجود تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ضروری نہیں کہ کسی کی ہر بات سے اتفاق ہوجائے لیکن معقول توجیہ کو بھی رد کردینا، انانیت اور استکبار ہے، احقاق حق نہیں ہے، وحدۃ الوجود ہی کو لیجیے خود اہل تصوف میں ہی اس کے متعلق مختلف رائے ہے، لیکن اس نظریئے کے حاملین کو مشرک و گمراہ قرار دینا کہاں تک

پھلواری شریف۔

درست ہے؟ ''ابن تیمیہ نے ابن عربی کو طواغیت میں شمار کیا ہے'' مقالہ نگار یہ لکھ کر خوش اور مطمئن ہوگئے، ابن تیمیہ نے ''الفرقان بین اولیاء الرحمٰن واولیاء الشیطان'' میں ابن عربی کو اور بھی بہت کچھ کہا ہے، اولاً تو ابن تیمیہ سے بچا کون ہے، نہ اسلاف نہ ان کے معاصرین، ثانیاً یہ کہ شیخ ابن عربی کی تحریف شدہ تحریروں پر فوراً اعتماد کر لینا اہل دانش کا طریقہ نہیں ہے، ابن عربی کی تمام کتابیں محفوظ نہیں ہیں۔ امام شعرانی نے ''الیواقیت والجواھر'' میں شیخ کے قابل اعتراض اقوال کو تحریفات میں شمار کیا ہے، بالخصوص وحدۃ الوجود کے بارے میں ایسی باتیں شیخ کی طرف منسوب کردی گئی ہیں جو شیخ نے نہیں لکھی ہیں، امام شعرانی لکھتے ہیں:

وجميع ما عارض كلامه ظاهر الشريعة وماعليه الجمهور فهو مدسوس عليه كما اخبرني بذلك سيدى ابو الطاهر المغربى نزيل مكة المشرفة ثم اخرج لى نسخة الفتوحات التى قابلها على نسخة الشيخ التى بخطه فى مدينة قونية فلم ار فيها مما كنت وقفت فيه و حذفته حين اختصرت الفتوحات۔

صوفیہ پر یہ الزام کہ وہ عالم کو عین حق کہتے ہیں اور ہر چیز کو عین حق سمجھتے ہیں، سرے سے غلط ہے، جو صوفیہ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں وہ بھی حلول واتحاد کا انکار کرتے ہیں، شیخ اکبر نے بھی اس کا انکار کیا ہے (موقع ملا تو اس پر سیر حاصل گفتگو کی جائے گی) واجب اور ممکن میں اتحاد وانضمام ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ ذات باری تعالیٰ نہ کسی میں حلول کرسکتی ہے، اور نہ اس کی ذات میں کوئی شے ضم ہوسکتی ہے۔ صوفیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ حلول واتحاد سے قطعاً پاک ومنزہ ہے۔ یہ باتیں اس کی شان الوہیت کو خلاف ہیں۔ البتہ صفات الٰہی کو صوفیہ نہ عین ذات کہتے ہیں اور نہ غیر ذات، عالم کو عین ذات کوئی نہیں کہتا، اس کے باجود وحدۃ الوجود کے بارے میں اہل علم صوفیہ نے محتاط رویہ اختیار کیا ہے، اس پر زیادہ گفتگو کرنے اور عوام کے درمیان بیان کرنے سے منع کیا ہے، لیکن منکرین تصوف وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو اٹھا کر اہل تصوف کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔

مقالہ نگار نے جس ہندوستانی صوفی کا قول پیش کیا ہے وہ سرے سے غیر اسلامی ہے۔ ہم اس سے اپنی برأت کا ظہار کرتے ہیں، یہ صوفیوں کا نظریہ ہرگز نہیں ہے۔ اسی صفحے پر ابن عربی

کے جو حوالے ہیں وہ سب ان کی تحریف شدہ عبارت ہے، مقالہ نگار نے ان ہی سطور میں ظہور ذات اور ظہور صفات میں خلط مبحث کیا ہے۔صوفیہ انسان میں ظہور صفات کے قائل ہیں نہ کہ ظہور ذات کے، ظہور ذات کا جملہ اختیار کیا بھی جائے تو اس سے صفات باری تعالیٰ کی تجلی مراد ہوگی۔ جسم انسانی میں اس کا حلول مراد نہیں ہوسکتا۔ظہور صفات سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت، ارادہ، سمع، بصر، تکلم اور اس کی صفات عالیہ، شفقت، رحمت، عفو، درگذر اور کرم مراد ہیں، جو انسان کو بقدر ما یحتاج عطا ہوئی ہیں، اس کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اور اس کو تسلیم کرنے سے شرک کیسے لازم آئے گا؟ مقالہ نگار کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف اور اہل تصوف کو مطعون کرنے کے لئے جہاں جو رطب و یابس ان کو ملا ہے سب کو جمع کر لیا ہے اور ان سب کو جملہ صوفیائے کرام کا نظریہ قرار دے دیا۔ نہ اصل ماخذ اور کتاب دیکھی ہے اور نہ ان کتابوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، حاطب اللیل کی طرح رطب و یابس جمع کر لئے، اس کی واضح مثال وہ شعر ہے جو انہوں نے صفحہ ۱۰۱ پر نقل کیا ہے۔ جیسا کہیں سنا ہوگا ویسا ہی نقل کر دیا۔ یہ آسی غازی پوری کا شعر ہے، ان کے دیوان میں دیکھا جا سکتا ہے، اس کا پہلا مصرعہ اس طرح ہے۔

''وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہوکر''

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو مستوی عرش ہے جیسا کہ پہلے تھا۔البتہ اس کے انوار و تجلیات اور اس کی صفات عالیہ (شفقت، رحمت، عفو، درگذر اور کرم وغیرہ) کا ظہور حضرت رسول اللہؐ کی صورت میں دنیا والوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کیا گیا ہے۔شاعر نے خود وضاحت کی ہے کہ اس شعر میں نزاکت ہے ''ہے'' کی جگہ پر ''تھا'' پڑھیں گے تو کفر ہوگا۔ ''ہے'' اور ''تھا'' میں جو فرق ہے وہ مقالہ نگار خود سمجھنے کی کوشش کریں۔کسی کی بات غلط نقل کر دینا خیانت کے زمرے میں آتا ہے اور کہاں کہاں انہوں نے اس قسم کی خیانت کی ہے تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کا مقصد اہل تصوف کو بدنام کرنا ہے۔اسی لیے ان کے انداز تحریر سے اہل تصوف کے خلاف شدید بغض و عناد ظاہر ہوتا ہے۔

اگر صوفیہ، یہود، نصاریٰ، مجوس اور مشرکین سب کو برابر سمجھتے اور اصنام میں جلوۂ خداوندی کے قائل ہوتے تو اسلام کی دعوت کیوں دیتے، کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو اسلام

کی طرف لانے کی عظیم خدمت اہل تصوف نے ہی زیادہ کی ہے۔

اگرچہ بات طویل ہوجاتی ہے لیکن شیخ اکبر محی الدین بن عربی کی مقالہ نگار نے تہذیب ومتانت سے پرے ہوکر جتنی لعنت وملامت کی ہے اس کے پیش نظر شیخ کی وہ عبارت پیش کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں شیخ نے اپنے عقیدۂ حقہ کی وضاحت فرمائی ہے، پوری عبارت امام شعرانی کی کتاب الیواقیت والجواہر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اہم حصہ یہ ہے۔

فیا اخوانی ویا احبابی رضی الله عنکم وعناانی اشهد الله تعالیٰ واشهد ملا ئکته و انبیاء ه ومن حضر من الروحانیین او سمع انی اقول قولاً جاز ما بقلبی ان الله تعالیٰ اله واحد لا ثانی له منزه عن الصاحبة والولد ما لك لا شریك له ملك لا وزیر له صانع لا مدبر معه موجود بذاته من غیر افتقار الی موجود یوجده بل كل موجود مفتقر الیه فی وجوده فالعالم كله موجود به وهو تعالیٰ موجود بنفسه لا افتتاح بوجوده ولا نهایة لبقائه بل وجود مطلق قائم بنفسه لیس بجوهرفیقدر له المكان ولا بعرض فیستحیل علیه البقاء ولا بجسم فیكون له الجهة والتلقاء مقدس عن الجهات والاقطارمرئی بالقلوب والابصار استوی علی عرشه كما قاله وعلی المعنی الذی اراده كما ان العرش و ما حواه به استوی وله الآخرة والاولیٰ لیس له مثل معقول ولا دلت علیه العقول لا یحد ه زمان ولا یحویه مكان وهو الآن علی ما علمه كان لانه خلق المتمكن والمكان وانشاء الزمان ۔

شیخ کا یہ بیان منکرین تصوف اور مخالفین شیخ کے پڑھنے کے لائق ہے، اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو کتاب وسنت سے معارض ہو، اس عبارت سے ظاہر ہے کہ شیخ کا عقیدہ وحدۃ الوجود کے بارے میں وہ نہیں ہے جو مقالہ نگار نے جا بجا پیش کر کے ان پر الحاد اور شرک کا الزام عائد کیا ہے، بہرحال یہ ایک تفصیلی گفتگو کا موضوع ہے۔

ہم مقالہ نگار کے دوسرے مزعومات کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ آیت کریمہ ھو الاول

والآخر والظاهر والباطن ،کی تشریح اتنی سہل بھی نہیں ہے کہ مقالہ نگار نے علامہ شبلیؒ کی بات چٹکیوں میں اڑا دی، شبلی جیسا ماہر لسانیات اور استاذ زمانہ'' وھو بکل شئ علیم ''کا جملہ نہ سمجھ سکا؟ حیرت ہے موصوف کی دیدہ دلیری پر۔ وہ اس قسم کی بات کر رہے ہیں جیسے ان کے مقابل کوئی طفل مکتب ہے ۔ پوری آیت مبارکہ میں صفات کے درمیان ''و'' آکر ہر لفظ میں معنوی مغایرت پیدا کر رہا ہے اور بکل شئ علیم سے قبل ''و'' آکر ماقبل سے مابعد کے مفہوم کو الگ کر رہا ہے۔ھو الاول سے شئ علیم تک مضمون و مفہوم ایک نہیں ہے۔ پوری آیت کریمہ سے صرف احاطہ علمی مراد لینا مضمون نگار کے فہم قرآن سے ناواقفیت کی دلیل ہے، بلکہ وہ عربی زبان کے رموز سے بھی ناواقف ہیں۔ اگر ھو الاول والآخر والظاھر والباطن ، سے احاطہ علمی بیان کرنا مقصود ہوتا تو وھو بکل شئ علیم لانا عبث ہوتا اور یہ ممکن نہیں ہے۔ موصوف خود ہی نہیں سمجھ سکے اس آیت کریمہ کو اور علامہ شبلی پر تنقید کر دی ''خود فراموشی کند تہمت دہد استادرا'' باری تعالیٰ کی یہ صفات اربعہ درحقیقت اس کے وجود کی وحدت کی طرف اشارہ کرتی ہیں علامہ شبلی کی اتنی عمدہ وضاحت بھی جن کی سمجھ میں نہ آسکے تو پھر ان کو کون سمجھائے؟ حدیث شریف میں تو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے کو مطلقاً باطل قرار دیا گیا ہے۔ وہاں معبود اور الہ کا بھی ذکر نہیں۔ دیکھئے بخاری ج ۲ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اصدق بیت قاله الشاعر الا کل شئ ما خلا الله باطل ۔(صحیح بخاری ج ۲، صحیح مسلم، کتاب الشعر جلد دوم)

توحید کے درجات پر بھی مضمون نگار کو اعتراض ہے۔ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب کی تشریحات توحید ذاتی و صفاتی کو مذموم بنا کر پیش کیا ہے اور حسب عادت غیر اسلامی قرار دیا ہے۔ سورہ اخلاص اور بنی اسرائیل کی آیات نقل کر کے مقالہ نگار نے ص ۱۸ پر توحید کی جو تشریح کی ہے حاشا وکلا کہ کسی صوفی یا عالم دین کو بلکہ ایک ادنیٰ مسلمان کو بھی اس سے اختلاف ہو۔ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب یا دیگر متقدمین صوفیہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ توحید کی کیفیات اور اس عقیدہ کو تسلیم کر لینے کے اثرات ونتائج ہیں۔ وہ قرآن کریم سے ہرگز معارض نہیں ہے۔ رہ گیا توحید صوفیہ سے اصحاب رسولؐ کی تحقیر ہوئی تو یہ مقالہ نگار کی کج فہمی ہے۔ عہد صحابہ میں احوال و

کیفیات کے لئے زبان بیان نہیں تھی، لیکن کیا صحابہ کی توحید اسی درجہ کی تھی جس درجۂ توحید کے حامل مضمون نگار اوران کے ہم مذہب ہیں؟ اگرانہیں یہ خوش فہمی ہے تو اس کو کیا کہا جائے۔

ع دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

امام غزالی اور شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بلا شبہ توحید کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔موصوف مقالہ نگار وجود میں شرکت کے قائل ہیں تو یہ ان کی توحید کا مرتبہ ہوا۔ اہل تصوف شرکت فی الوجود کو بھی توحید خالص کے منافی سمجھتے ہیں۔ یہ دوئی جب ختم ہوگی تو فنا فی التوحید کا مرتبہ حاصل ہوگا اور جب بندہ مقام فنائیت پر پہنچ جائے گا تو اس پر کشف واشراق اور علم وادراک کے تمام در کھل جائیں گے۔ یہ غیب نہیں ہے۔غیب کا علم تو صرف اللہ کو ہی ہے۔اللہ اپنے نبیوں کو جتنا چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَا اِلَيْكَ ۔(هود۴۹)۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَسُوْلٍ (الجن ۲۶۔۲۷)۔

وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَاتَأْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّ خِرُوْنَ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۔(آل عمران ۴۹)۔

اوراس جیسی دوسری آیات ایک سمجھدار آدمی کے لئے کافی ہیں۔آیت کریمہ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْىءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ (البقرہ ۵۵) سے ظاہر ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں کا بندے پر منکشف ہوجانا بندے کے حد امکان میں ہے۔ بخاری کی یہ حدیث فنائیت ہی ثابت کرتی ہے۔

من عادیٰ لی ولیا فقد آذنته بالحرب وما تقرب الی عبدی بشی ء احب الی مما افترضت علیه ولا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببته فکنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بهاورجله التی یمشی بها وان سالنی لاعطینه ولان استعاذنی لاعیذنه وما ترددت من شی ء انا فاعله ترددی عن نفس المومن یکره الموت وانا اکره مسئالته ۔(بخاری ج ۲ باب التواضع عن ابی ھریرہ)

اولیاء اللہ کی اس بڑھی ہوئی کیفیت اشراقی کو علم الٰہی کے برابر سمجھنا غلط ہے۔علم الٰہی کی

ہم سری تو ممکن ہی نہیں ہے۔علم الٰہی حد ونہایت سے وراء ہے۔کائنات ارضی اپنی وسعت کے باوجود علم الٰہی کے سامنے رائی کے دانے سے زیادہ نہیں ہے۔ ماہرین فلکیات نے ثابت کیا ہے کہ فضائے بسیط میں بے شمار کہکشائیں گردش میں ہیں۔بعض تو زمین سے زیادہ بڑی ہیں۔ان بے شمار عوالم میں عالم ارضی کا کسی بندے پر منکشف ہوجانا معمولی بات ہے۔اس سے علم الٰہی کی ہمہ گیری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔اقطاب واوتاد کا ذکر بعض احادیث میں ہے۔اس پر اعتراض کم علمی ہے۔مقالہ نگار نے سورہ اعراف کی جو آیت صوفیہ کے موقف کے رد وابطال میں پیش کی ہے وہ استدلال ''الا بما شاء'' سے خود ہی رد ہوجاتا ہے۔غیب ہو یا کشف ہو وہ سب مشیت الٰہی سے ہی متعلق ہے،مشیت الٰہی نہ ہو تو کچھ نہیں ہوسکتا۔عالم غیب کیا عالم مشاہدہ بھی بندہ کی دست رس سے باہر ہوگا۔قسط اول کے ص ۲۲ میں مقالہ نگار نے اولیاء اور اقطاب اور ان کے روحانی تصرفات پر طنز وتعریض کی ہے اور اس کو صوفیوں کی اولیاء پرستی سے تعبیر کیا ہے حالانکہ مقالہ نگار نے خود تسلیم کیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا وجود اس کائنات میں بالذات قوت واقتدار کا مالک نہیں ہے'' (۲۰) اس دعوی کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس کی مرضی سے بالعرض قوت و اقتدار کا مالک ہوسکتا ہے۔اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد کیوں اتنا واویلا ہے۔یہ سب مزعومات اور ہفوات قابل بحث ہی نہیں ہیں۔ان چیزوں کا امکان کتاب وسنت سے ثابت ہے۔وقوع میں آئے یا نہ آئے۔رسالت کے متعلق صوفیہ کا عقیدہ وہی ہے جو کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ شیخ عبدالکریم جیلی کی عبارت محل نظر ہے۔آیا وہ انہیں کا قول ہے یا تحریف؟ انہوں نے کیا کہنا چاہا ہے؟ ان کی کتاب کی پوری عبارت کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔اگر وہ واقعی ختم نبوت کے منکر ہوتے تو اہل تصوف کے حلقہ میں کب کے مردود ومطعون ہوچکے ہوتے۔میں نہیں سمجھتا کہ اپنے شیخ کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا۔اس مشکوک بات کو مقالہ نگار نے تمام صوفیہ کا عقیدہ بنادیا۔ عنداللہ اس تہمت اور بہتان پر جواب دہی کا احساس ہونا چاہیے۔وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَااكْتَسَبُوْا فَقَدِاحْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۔ (الاحزاب ۵۸)

ایسا تو نہیں کہ مقالہ نگار یہود ونصاریٰ کی روش پر چل رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی یاد سے

مسلمانوں کو غافل کرنا ان کی شعوری یا غیر شعوری کوشش ہے۔ ذکر اور دوام ذکر پر قرآن کی آیات اتنی ہیں کہ ان سطور میں ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، اس کو غلط قرار دینا اور اس کا استہزاء کرنا ایک مومن کا کام نہیں ہوسکتا۔ مولانا عبدالباری ندوی کے رد میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر طفلانہ اور سطحی ہے کہ اس کا جواب دینا بھی بار خاطر محسوس ہو رہا ہے۔ آل عمران کا پورا آخری رکوع اس بات کا شاہد ہے کہ مقالہ نگار کا دعویٰ اور دلیل دونوں ان کی کم علمی کا ثبوت ہے۔ ان آیات سے دوام ذکر کے ساتھ تعلق مع اللہ ثابت ہو رہا ہے۔ تخلیق ارض وسماء میں تفکر کا نتیجہ ایمان میں مزید پختگی کا سبب ہے اور تبتل اور انابت الی اللہ کی کیفیات اس سے راسخ ہوتی ہیں۔ تفکر تخلیق ارض وسماء سے شاید مضمون نگار صوفیوں کو سائنسداں بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی کوئی بات اشارۃً بھی آیات سے ظاہر نہیں ہوتی۔ مغالطہ انگیزی مقالہ نگار کی تحریر سے واضح ہے۔ مراقبہ اور مشاہدہ حق کو عجمی چیز کہنا رموز دین سے بے خبری ہے۔ جو شخص مسلمانوں کو کثرت عبادت اور کثرت ذکر سے روکتا ہو اس کا مومن ہونا مشکوک ہے۔ یہ کام نصاریٰ، یہود اور مشرکین کا ہے۔ افسوس کہ نفس پرستوں کی اس بھیڑ میں خدا پرست بے آبرو ہو رہے ہیں۔ ہم مقالہ نگار کو دو آیت کریمہ پر فکر کی دعوت دیتے ہیں، وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (الاعراف ۲۰۵)۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۔(النور ۳۷) ایک آدمی کس طرح دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرے اس کی زبان بھی نہ ہلے۔ آواز بھی نہ نکلے۔ صبح سے شام تک یاد الٰہی میں لگا رہے۔ خرید و فروخت اور امور تجارت میں مصروف رہے اور یاد الٰہی سے ایک لمحہ کی غفلت بھی نہ ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

اہل تصوف پر رہبانیت کا الزام نیا نہیں ہے۔ مقالہ نگار اپنے ان ہی اسلاف کی ترجمانی کر رہے ہیں جو تصوف کے منکر و معاند تھے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں نے بھی رہبانیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ منکرین کے پھیلائے ہوئے پروپگنڈے سے متاثر ہوگئے۔ رہبانیت کا لفظ سن کر ہی ان کی پیشانی پر بل آجاتے ہیں۔ قرآن کریم میں سورہ حدید کی یہ آیت کریمہ وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا کی صحیح تشریح نہیں کی۔

مقالہ نگار نے اس لفظ کی آڑ لے کر خوب خوب صوفیوں کو مطعون کیا ہے، مقالہ نگار کو آخرت میں جواب دہی کا ذرّہ برابر احساس ہوتو وہ بتائیں کہ سورہ حدید کی اس آیت کریمہ سے کس طرح رہبانیت کی مذمت اور نفی ثابت ہورہی ہے؟ آیت مذکورہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم نے نصاریٰ کو رہبانیت کا مکلّف نہیں بنایا تھا۔انہوں نے رضائے الٰہی کے لئے یہ راہ خود منتخب کی۔ پھر رہبانیت کی رعایت نہ کر سکے۔ یہاں رہبانیت کو اللہ تعالیٰ نے مذموم نہیں قرار دیا ہے۔اگر رہبانیت (یعنی اپنے ایمان کی حفاظت،ضبط نفس اور حب دنیا سے بچنے کے لئے خلق خدا سے الگ ہوکر،لذات دنیوی کو چھوڑ کر ویرانہ وصحرا میں اللہ کی عبادت کرنی) مذموم اور بری چیز ہوتی تو ''فَمَارَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ''نہیں کہا جاتا۔ایک غلط اور غیر اسلامی فعل کی رعایت کیا معنی رکھتی ہے؟ مَاكَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ترک وتجرید کا فرض ہونا مصالح کے خلاف ہے۔اس لئے ترک وتجرید کی زندگی نصاریٰ پر فرض نہیں کی گئی اور نہ مسلمانوں پر۔لیکن رضائے الٰہی کے حصول کے لئے یہ راہ اختیار کی جاسکتی ہے۔اباحت کا پہلو اس میں محفوظ ہے۔ فرضیت کی صورت میں ہر شخص اس کا مکلّف ہوتا اور اجتماعی زندگی متاثر ہوتی، مَاكَتَبْنٰهَا عَلَيْهِم سے رہبانیت کی مذمت ثابت کرنا تفسیر بالرائے ہے۔اللہ تعالیٰ نے کچھ ہی چیزیں ہم پر فرض عین کی ہیں جس کی قضا لازم کی ہے۔اس کے باوجود ہم بہت سے مباحات پر التزاماً عمل کرتے ہیں۔احادیث بھی اس کی تصدیق وتائید کرتی ہیں۔بخاری کی حدیث ہے۔

یوشك ان یکون خیر مال المسلم غنم یتبع بها شعف الجبال ومواقع القطر یفر بدینه من الفتن ۔(المجلد الثانی باب من الدین الفرار من الفتن)

ترمذی کی حدیث اور واضح ہے۔ سئل رسول الله صلی الله علیه وسلم ای الناس افضل فقال رجل یجاهد فی سبیل الله ۔قالواثم من ؟قال مومن فی شعب من الشعاب یتقی ربه ویدع الناس من شهرة ۔(ابواب فضائل الجہاد)اس مضمون کی حدیثیں دیگر صحاح وسنن اور مسانید میں بھی ملیں گی۔

نصاریٰ کی رہبانیت عدم رعایت سے مطعون ہوئی۔عقیدۂ تثلیث اختیار کر لینا ان کی بنیادی خامی تھی۔ازدواجی تعلقات سے دوری ان کی رہبانیت کی شرط اول تھی لیکن وہ بظاہر عوام

کی نظروں مین تعلقات زن وشو سے دور رہے، لیکن درون خانہ بدکاری کی راہ کھلی رکھی۔ وہ بظاہر تارک دنیا درویش بنے رہے لیکن ان کے ذاتی خزانے مال وزر سے بھرے ہوتے تھے۔ تفہیم القرآن میں آیت مذکورہ کی تفسیر میں مولانا مودودی صاحب نے رہبانیت کی شرائط اور تفصیلات لکھی ہیں ان کو پڑھ جائیے۔ شریعت اور مذہب تو کجا عام اخلاق بھی ان کو گوارا کرنے کو تیار نہیں۔ حدیث میں جس رہبانیت کی نفی کی گئی ہے وہ نصاریٰ کی یہی رہبانیت ہے جس کی نظیر عہد رسالت میں موجود تھی ورنہ رہبانیت خوف خدا کے مفہوم میں قطعاً غیر اسلامی چیز نہیں ہے۔ چونکہ رہبانیت نصاریٰ کی بے اعتدالیوں سے مطعون ہوچکی تھی اس لئے اس لفظ کا استعمال مسلمانوں میں تقریباً متروک ہوگیا۔ اس کی جگہ 'ترک دنیا'' نے لے لی، ترک دنیا کے لفظ پر بڑا واویلا ہے حالانکہ اس کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ اپنے دین وایمان کی حفاظت کے لئے، عبادات میں یکسوئی کے لئے، نفس کی سرکشی پر قابو پانے کے لئے خلق خدا سے دور رہنا اور آسائش دنیوی کو چھوڑ دینا ترک دنیا ہے۔ نصاریٰ کی رہبانیت اور اہل تصوف کے ترک دنیا میں بعد المشر قین ہے دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ اہل تصوف کی تمام دینی اور اخلاقی خدمات محفوظ ہیں۔ ان کی تاریخ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ جھوٹے پروپیگنڈے سے حقیقت بدل نہیں سکتی۔ جن صوفیوں نے ترک وتجرید کی راہ اختیار کی وہ کبھی کسی اخلاقی برائی میں ملوث نہیں ہوئے۔ جنہوں نے حکومت وسلطنت چھوڑی وہ کبھی زندگی میں مال ودولت کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ جس راہ پر انہوں نے قدم رکھا تا دم آخر ثابت قدم رہے۔ وہ ''فَمَارَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا'' کے ہرگز مصداق نہیں ہیں۔ رہبانیت کے نام پر مغالطے دینے والے منکرین تصوف نے تمام صوفیوں کو صحراؤں اور جنگلوں میں پہنچا دیا اور سب کے بارے میں تاثر دینے کی کوشش کی کہ سب رہبانیت کے قائل اور رہبانیت کی راہ پر ہیں۔ انفرادی طور پر چند اہل تصوف کو چھوڑ کر سارے صوفیہ تارک دنیا نہیں ہوگئے تھے۔ تاریخ موجود ہے۔ مگر افسوس سوئے ظن رکھنے والے سے حسن ظن کی توقع فضول ہے۔ صوفیوں کے موجودہ خانوادے اس بات کی دلیل ہیں کہ انہوں نے معاشرتی زندگی قوم کے درمیان گذاری۔ اسلام کی اشاعت کی، لوگوں کی تہذیب نفس کی، درس وتدریس کی مسندیں آباد کیں، معاشرے کی اصلاح کی، ازدواجی زندگی بسر کی، اولاد کی پرورش کی، اقرباء کے حقوق ادا کرتے رہے اور

ساتھ میں حب جاہ اور فتنۂ دنیا سے بھی بچے رہے اور ایسے صوفی بھی تاریخ کے ابواب میں روشن ہیں جنھوں نے باقاعدہ جہاد کیا۔ ایمان کی حفاظت جان و مال کی حفاظت سے زیادہ اہم ہے، امت میں ایسے لوگ بھی گذرے ہیں جو ہوس پرست انسانوں، عیاش امراء، ظالم حکمرانوں اور دولت و مناصب کی طرف بھاگتے دوڑتے اپنے بھائیوں کو دیکھ کر اپنے ایمان کے بارے میں اتنے خوف زدہ ہوئے کہ جنگلوں اور صحراؤں کی راہ لی۔ یہ تھوڑے لوگ تھے، لیکن منکرین تصوف نے جھوٹے پروپگنڈے سے رائی کو پہاڑ بنا دیا۔

بخاری اور ترمذی کی حدیث کے مطابق فتنۂ دنیا سے فرار حاصل کر کے محفوظ جگہ اختیار کر لینا یا گوشہ نشیں ہو جانا ہرگز قابل مذمت نہیں ہے۔ سورہ حدید کی آیت کریمہ سے اگر نصاریٰ کی رہبانیت کا رد ہوتا ہے تو صوفیائے کرام کے ترک و تجرید اور رہب وخوف کا اثبات ہوتا ہے۔ تنگ نظری، نفسانیت اور عصبیت جاہلیہ کی طرح تعصب کا پردہ عقل پر نہ ہو تو یہ بات سمجھ لینی مشکل نہیں۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنھوں نے ایمان کی حفاظت کے لئے معاشرہ سے علیحدگی اختیار کی وہ عزیمت پر نہیں بلکہ رخصت پر عمل کرنے والے لوگ ہیں۔

مقالہ نگار کا منشاء مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی یادوں سے دور کر دینا ہے۔ صلوۃ معکوس کے جواز پر مولانا اشرف علی تھانوی نے بہت مناسب دلیل دی ہے لیکن مضمون نگار کو وہ بھی ہضم نہیں ہوئی اور ان پر غلط تاویل میں مہارت کا الزام لگا دیا۔ یہ یاد رہے کہ اس عمل کو صلوۃ معکوس کہتے ضرور ہیں لیکن حقیقت میں یہ کوئی رکوع وسجود والی نماز نہیں ہے بلکہ ذکر کا ایک طریقہ ہے۔

قلب و ذہن کو ماسوا اللہ کے خیال سے پاک رکھنا اہل تصوف کے یہاں توحید کا لازمہ ہے۔ وہی بات شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھی ہے۔ مقالہ نگار کو اس پر بھی اعتراض ہے۔ مقالہ نگار نے اس کو غیر منصوص قرار دیا ہے یعنی قرآن اس کی تعلیم نہیں دیتا۔ پچھلی سطور میں سورہ اعراف کی آیت کریمہ ہم نقل کر چکے ہیں۔ اس میں ولا تکن من الغافلین کہہ کر ذکر الٰہی میں غفلت سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اور اپنی یاد میں ہمہ وقت منہمک رہنے کا حکم دیا ہے۔ ''تصحیح خیال'' کی جو بات شاہ ولی اللہ صاحب نے کی ہے (یعنی غیر اللہ کی یاد اور خیال سے قلب و دماغ کو پاک

رکھنا) اس میں اور قرآن کے مطابق ذکر الٰہی سے غافل نہ رہنے میں کیا فرق ہے؟ دونوں باتیں بنیادی طور پر ایک ہی ہیں جب بندہ ہمہ وقت دل و دماغ سے اللہ کی طرف ذکر کے ذریعہ متوجہ رہے گا تو پھر غیر اللہ کا گذر کہاں ہوگا؟ اس لئے تصحیح خیال کو غیر منصوص کہنا غلط ہی نہیں قرآن کے تصور توحید کے بھی خلاف ہے۔

مقالہ نگار نے اہل تصوف کی مغالطہ انگیزی کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ اہل تصوف (بشمول سلف وخلف) کی شخصیات پر اور ان کی نیتوں پر براہ راست حملہ ہے، یہ بات اخلاقی طور پر صحیح نہیں ہے اور مسلمانوں کے بارے میں حسن ظن رکھنے کی نبوی تعلیمات کے بھی خلاف ہے۔ کیا اب قلم کا کوئی معیار نہیں رہا؟ جب پڑھے لکھے لوگوں کا یہ اخلاق ہے تو کم علموں اور جاہلوں کا کیا انداز ہوگا؟ کہنے کو تو بہت سی باتیں ہیں لیکن ان سطور میں سب کی گنجائش نہیں ہے، اہل علم کو چاہیے کہ مقالہ نگار کی تحریر کا تفصیلی جائزہ لے کر تصوف سے گرد وغبار کو دور کریں۔

اخبار علمیہ

''جرمنی میں اسلامی شریعت کے مطابق تاریخ ساز فیصلہ''

عربی روزنامہ ''سبق الیکترونیہ'' کے مطابق ترکی نژاد میاں بیوی میں گھریلو جھگڑے کے سبب طلاق ہوگئی، شوہر نے بیوی کو ۱۲/ہزار یورو کے زیورات مہر میں دیے تھے، طلاق کے بعد شوہر نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا اور جرمنی کے شہر لمبرگ آن ڈیرلان (Limburg an der Lahn) کی عدالت میں مقدمہ دائر کردیا تو جرمن جج نے اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ میں کہا کہ مہر کے زیورات شوہر کو واپس نہیں دیے جاسکتے، یہ بیوی کا شرعی حق ہے۔ جرمن ذرائع ابلاغ نے اس فیصلہ کو ملکی تاریخ میں اسلامی قانون کے مطابق ہونے والا پہلا فیصلہ قرار دیا ہے اور بار کونسل کے بعض مقتدر عہدے داروں نے ایک بیان میں کہا کہ جرمنی جمہوری ملک ہے اور اس کے قانون میں تمام مذاہب کی ترجمانی اور اس کا لحاظ لازمی ہے، اسلام یا کسی بھی آسمانی مذہب کا ایسا قانون جس میں انسان دوستی اور معاشرتی خیرسگالی پائی جاتی ہو، اس کو عدالتی دفعات میں جز بنانا ملک کی بقا و سلامتی اور امن کے لیے مضر نہیں ہے بلکہ اس قابل تحسین اقدام سے اقلیت کے دل میں جرمنی سے تعلق اور اس کی عدلیہ پر اعتماد میں اضافہ ہوگا۔ جرمنی کی اکیاسی ملین آبادی میں مسلمان ۴ ملین ہیں جس میں اکثریت ترکی نژاد ہے، اس فیصلہ سے جہاں جرمنی کے مسلمانوں اور جمہوریت پسند عیسائیوں میں خوشی ہے وہیں کلیسا کے ایوانوں میں ناراضی بھی ہے۔

''نمما نر جولے سوتی''

یہ وایاناڈ ضلع کے پلپلی کے ایک یتیم خانہ کی سربراہ سسٹر میری چانڈی کی خودنوشت سوانح عمری ہے اور اس وقت اس کو خوب شہرت و مقبولیت حاصل ہورہی ہے، اس کی وجہ اس کی علمی، تحقیقی اور ادبی عظمت یا معیار و اسلوب بیان کی دلکشی و جاذبیت کے بہ جائے وہ سنسنی خیز انکشافات و حقائق ہیں جو مشینری کے کلیساؤں، تعلیمی اداروں میں ہونے والی شرمناک اور غیر اخلاقی حرکتوں کا بیان ہے، مصنفہ نے راہبوں، مبلغوں اور استادوں کے حیاسوز واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کلیسا کی زندگی روحانیت کی بجائے شہوت رانی و ہوا پرستی کی ہوگئی ہے اس لیے اس کے ذمہ داروں کو اصولوں میں تبدیلی لاکر راہبوں کو باضابطہ شادی کی اجازت دے دینی چاہیے۔

''بودھوں کی اسلام دشمنی اور عصبیت''

عرب خبر رسان ایجنسی المصراوی کے مطابق سری لنکا میں سنہال اور تامل اکثریت کے علاوہ ۲ ملین یعنی ۲۰ لاکھ مسلمان ہیں، ۱۰ فیصد ہندو بھی ہیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہاں بدھوں کے قلوب بہ توفیق خداوندی نور اسلام سے منور ہورہے ہیں، اسلام کی اس مقبولیت سے انتہا پسند بدھسٹوں کی آتش غضب بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سری لنکا کا سرکاری مذہب بدھ مت ہے، اس لیے مسلمانوں کی مذہبی سرگرمیاں محدود ہونی چاہئیں۔ جمعہ کی نماز عام دینی اجتماعات اور تبلیغ اسلام کی کوششوں پر پابندی ہونی چاہیے، خبر کے مطابق گذشتہ دس برسوں میں ۲ سو مسجدیں ان کی انتہا پسندانہ اور متعصّبانہ حرکتوں کا نشانہ بن چکی ہیں۔ غنیمت ہے کہ حکومت کا طرز عمل معاندانہ نہیں ہے اور مسلمانوں کے ۵ سو ابتدائی اسکولوں اور ۲ سو دینی مدرسے قائم ہیں اور بعض تعلیمی اداروں کی حکومت سرپرستی بھی کرتی ہے۔

''ماسکو میں مدعی خدائی کی خودسوزی''

جنیوا نامی ایک جدید مذہبی فرقہ ہے جس کا وجود اور نشو ونما صحرائے افریقہ کے بربروں سے منسوب ہے، موسیقی بالخصوص صوفی مذہبی نغموں اور رقص کو یک جا کر کے اس فرقے نے الگ مذہب نکالا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ رقص و موسیقی نماز اور زندگی کا جشن ہے، روس، وسط ایشیا کی ریاستوں چین، شمالی کوریا، سعودی عرب، ایران اور دیگر خلیجی ممالک میں اس مذہب پر پابندی ہے، اس کے باوجود اس فرقہ کے ۲ لاکھ افراد پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس فرقہ کے ایک ۳۷ سالہ شخص نے اب خدائی کا دعوا بھی کیا، خبر کے مطابق اس نے اپنے اوپر مٹی کا تیل انڈیل کر خود کو آگ کے حوالہ کردیا۔ یہ واقعہ ماسکو سے ۳۳ کلومیٹر کے فاصلہ پر پیش آیا، رپورٹ میں اس کا نام درج نہیں، روزنامہ مصنف حیدرآباد کے پہلے صفحہ پر یہ خبر شائع ہوئی ہے۔

''خودکشی کے متعلق ایک عجیب خبر''

برطانوی جریدہ ''ڈیلی میل'' کے مطابق جاپان کے ماؤنٹ فیوجی کے دامن میں Aokiguhara نامی سرسبز وشاداب اور نہایت گھنا ایک جنگل ہے، جہاں وہی شخص جاتا ہے جس نے اپنی زندگی سے رشتہ ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہو، ڈیلی میل سے گفتگو کرتے ہوئے ایک جاپانی شخص شینا کموڈا نے کہا کہ جاپانی

قوم شعبۂ حیات کے ہر گوشہ میں انفرادیت کی ہمیشہ سے متلاشی رہی ہے، بہ حیثیت قوم اس نے روش عام سے الگ خودکشی کا الگ راستہ اختیار کیا ہے، صحافیوں نے اس جنگل میں بکھرا ہوا سامان اور درختوں، جھاڑیوں اور لہلہاتے پودوں کے درمیان قریب سو لاشیں دیکھیں، جنگل کی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ ہم ان کے اقدام خودکشی کو قانوناً روک نہیں سکتے ،۱۲ء میں اب تک سو سے زیادہ لاشیں ان جنگلوں میں پائی گئیں۔

''گنیز بک میں دنیا کے کلب اصغر کا اندراج''

فروری ۲۰۰۸ء میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق لمبے بالوں والا ''بوبو'' نامی کتے کی لمبائی ۶ء۱۰ سینٹی میٹر تھی، اس کا تعلق امریکی ریاست کینٹکی سے تھا لیکن اب یہ ریکارڈ مس ایزل کے ساتھ شمالی مشرقی پورٹو ریکن ٹاؤن، ارجنٹائن سے بھی وابستہ ہوگیا ہے، Chihuahua نسل سے تعلق رکھنے والے اس کتے کی لمبائی ۵۳ء۶ سینٹی میٹر اور وزن ایک کیلے کے برابر ۱۷۰ گرام ہے، پیدائش کے تین ہفتہ بعد اس کے قد و قامت میں ایک سینٹی میٹر کا بھی اضافہ نہیں ہوا تو اس کی مالکن اسے ذرائع ابلاغ کے سامنے لائیں، ان کا کہنا تھا کہ شروع میں اس کا منہ اس قدر چھوٹا اور تنگ تھا کہ دودھ بھی نہیں پی سکتا تھا، اس لیے آئی ڈراپ کے ذریعہ اس کو دودھ دیا جاتا تھا۔ گنیز بک کی ٹیم اس کے جسم کی تصدیق کے لیے پورٹو ریکن پہنچنے والی ہے۔

''ایک خوش نما و خوش رنگ پودے کی خوراک''

Nepenthaceae سے نسلی تعلق رکھنے والے Nepenthes Spathulata نامی انتہائی دلکش اور جاذب نظر پودا جاوا اور سماٹرا کے گرم علاقوں میں پایا جاتا ہے، اس کا تنا پانچ میٹر تک بڑھتا ہے، بالائی حصہ تقریباً ایک میٹر لمبا صراحی نما ہوتا ہے، خاص بات یہ ہے کہ چوہے اور گلہری وغیرہ جیسے جانور جب کشش کے سبب اس کے پاس بالائی حصہ میں پہنچ جاتے ہیں اور پھسل کر اندر سماتے چلے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ پودے کی نچلی سطح میں موجود خامرے ان شکاروں کو ہڈیوں سمیت ہضم کر جاتے ہیں، گوشت خور پودوں کا انکشاف تو اس سے قبل ہو چکا ہے، ہڈیوں اور دانتوں کو بھی نگل جانے والا یہ پودا پہلی بار دنیا کے ماہرین علم نباتات و حیوانات کے سامنے آیا ہے، تفصیلی رپورٹ بوٹانیکل جرنل ''لینین'' میں شائع ہوئی ہے۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

غالب اور بدایوں

۱۰/دسمبر ۲۰۱۱ء
21/112A گاڑھی خانہ،
فتح گڑھ، فرخ آباد

مدیر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نومبر کے معارف میں ڈاکٹر شمس بدایونی کی کتاب ''غالب اور بدایوں'' پر ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا طویل تبصرہ نظر سے گذرا۔ ڈاکٹر لطیف جیسے معمر محقق کا اس کتاب پر کچھ لکھنا اس کے معتبر ہونے اور مستند ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مجھے اس تبصرے کے حوالے سے دو باتیں عرض کرنا ہیں۔

اول: یہ کہ اس تبصرے میں دو جگہ کتابت کی فاش غلطیاں ہیں، صفحہ ۳۷۱ سطر نمبر ۶ پر ''مزار غالب نامی کتاب'' کو مرزا غالب لکھ دیا گیا ہے اسی طرح صفحہ ۳۸۶ سطر نمبر ۷ پر علو (ع ل و) کو غلو لکھا گیا ہے۔

دوم: یہ کہ ڈاکٹر لطیف نے بعض بدایونی تلامذہ غالب کی نسبت بدایوں اور نسبت تلمذ کی بابت لکھا ہے کہ وہ ''متحقق نہیں'' بایں وجہ یہ حصہ ''نظر ثانی کا محتاج ہے'' (صفحہ ۳۷۶)، اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ لطیف حسین صاحب کے نزدیک کسی شاعر کی وطنی نسبت کی اصل بنیاد محض اس کا اس جگہ پیدا ہونا ہے اگر اس شرط کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو غالب دہلوی اور میر دہلوی کے بارے میں کیا عذر پیش کیا جائے گا جب کہ ان دونوں کی پیدائش اکبر آباد میں ہوئی تھی۔

جہاں تک نسبت تلمذ کی بات ہے اگر معاصر ماخذ یا غالب کا کوئی خط تلمذ کی نشان دہی کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کو نا کافی سمجھنا اور ثبوت کا مطالبہ کرنا زیادتی ہے۔

اس مضمون سے کتاب کی اہمیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے، غالب انسٹی ٹیوٹ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے بہت عرصہ کے بعد ایک اہم اور نئے موضوع پر تحقیقی کتاب شائع کی۔ عصر حاضر میں تحقیق کا معیار جس تیزی سے گر رہا ہے یہ کتاب اس معیار کو برقرار رکھنے کا ایک خوبصورت وسیلہ بن گئی ہے میں اس کتاب کے مصنف، مبصر اور ناشر تینوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نیازمند

محمد رضوان احمد

مطبوعات جدیدہ

ذالك الكتاب : از جناب احمد ابوسعید، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۶۴، ہدیہ ۲۰۰ روپے، بذریعہ بک سیلر ۱۰۰ روپے، پتہ: شان پبلی کیشن 8-3-229/42 یوسف گوڑہ، طاہر ویلی، حیدر آباد ۴۵۔

قرآن مجید کی تفہیم اور ترجمانی کے لیے اس مفید کتاب کے مولف کی ایک بڑی قابل قدر کاوش کا ذکر ان سطروں میں پہلے آچکا ہے، یہ کتاب بھی اسی قرآنی خدمت ہی کا جزو ہے جس میں قرآن مجید کی تمام سورتوں کا عام فہم ترجمہ اور زمانہ کے تقاضوں کے پیش نظر چھوٹے چھوٹے جملوں میں ترجمانی اس طرح کی گئی ہے کہ ہر رکوع کی اول و آخر آیتوں کا حوالہ ہے اور پھر جامع اختصار سے ان کا ترجمہ اور تشریح ہے، محترم مولف کی زندگی کا مقصد ہی گویا یہی ہے کہ ہر مسلمان قرآنی تعلیمات سے دلچسپی رکھنے والا اور براہ راست استفادہ کرنے والا بن جائے، قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے فہم کا ذوق ہی ہمارے مسائل کی شاہ کلید ہے، ان کی خواہش تو یہی ہے کہ قرآن مجید کا اصل لطف تو عربی زبان جاننے میں ہے، اسی لیے ان کی نظر میں یہ کام اولیت رکھتا ہے، تاہم اس کے بغیر بھی قرآن مجید کی روح سے ہم کنار ہونے کی کوشش جس طرح مترجمین و مفسرین نے کی ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ ہے، اسی لیے انہوں نے اس کتاب میں ترجمانی کے لیے کسی مخصوص تفسیر یا ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے سامنے بیسیوں ترجمے رہے، یہ ان کی احتیاط اور نیت کی برکت ہے کہ اس کتاب کے اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے، زیر نظر پانچویں اور تازہ ترین اشاعت ہے اور مترجم کے الفاظ میں کوشش یہی رہی کہ ہر اشاعت بہتر سے بہتر ہو، معنوی بھی اور ظاہری بھی، مثلاً رنگین طباعت میں مدنی سورتوں کا رنگ ہرا رکھ کر مدنی آیات کی پہچان کو آسان تر بنا دیا گیا، توقع ہے کہ یہ کاوش مرتب کی نیت اور آرزوں کے عین مطابق کارآمد، نفع بخش اور موجب اجر ثابت ہوگی۔

اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء : از مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۴۰، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ فردوس، مکارم نگر لکھنؤ اور مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

تحریک ندوۃ العلماء اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تاریخ، دراصل انیسویں صدی کے اواخر سے

اب تک ہندی ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی گویا ایک تاریخ ہے، روایات اور عصری ضرورت اور ملت کے مختلف الابعاد نظریات اور رجحانات کو مثبت، نافع اور مستقیم سمت دینے کی ندوۃ العلماء کی نیت اور کوشش، نوعیت اور نتائج کے لحاظ سے گہرے اور غیر جانب دارانہ مطالعہ و تجزیہ کی متقاضی ہے، ادعائیت سے اس تحریک کو ہمیشہ نفور رہا، اعتصام بحبل اللہ اور امت مسلمہ کی خیر خواہی اور اسلام کی سربلندی کے لیے باخبری اور شعور کی سلامتی نے اس تحریک کو بہر حال عام امت کی نظر میں وقعت بخشی اور ان کے دلوں میں عزت بھی بخشی، زیر نظر کتاب میں ثقافت کے لفظ کا ابہام پہلے ہی باب سے دور کر دیا گیا کہ اسلامی ثقافت کا سرچشمہ قرآن کریم ہے اور ندوہ کا بنیادی مقصد اسی قرآن کریم اور اس کے علوم کی نشر و اشاعت ہے، عربی زبان و ادب میں ندوہ کے امتیاز کی شہرت محض لغات و لسانیات تک محدود نہیں بلکہ یہ امتیاز صرف قرآن کریم کی خدمت کی بدولت ہے، آج ندوہ کسی نہایت ترقی یافتہ تعلیمی ادارے کی طرح مختلف کلیات و معاہد سے معمور ہے اور ہر شعبہ متحرک اور فعال ہے لیکن دعوت الی اللہ، ارشاد و اصلاح معاشرہ کے بلند مقاصد میں صرف ایک جذبہ کارفرما ہے اور وہ ہے قرآن اور شارع اسلام کے پیام کو عام کرنا، اس کے پاک نیت بانیوں کا اخلاص ہی تھا کہ شیخ وقت مولانا امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے ندوہ کے قیام کو تائید غیبی سے تعبیر کیا تھا، مولانا فراہیؒ و علامہ شبلیؒ سے موجودہ اساتذہ تفسیر و حدیث و لغت تک ایک کہکشاں ندوہ کی زمین کو رفعت میں آسمان بناتی رہی، اس کتاب میں اسی حقیقی اسلامی ثقافت کے فروغ میں ندوۃ العلماء کی خدمات کا مفصل و مدلل بیان خود ندوہ کے لائق ترین اور مستند ترین نمائندہ و نمونہ کے قلم سے ہے، فاضل جلیل مصنف عربی اور اردو دونوں زبانوں میں جس مقام رفیع کے حامل ہیں وہ محتاج تعارف نہیں، ندوہ کے وہ مہتمم ہی نہیں نصف صدی سے زیادہ عرصہ میں ندوہ کے ہر مرحلہ تعمیر کے وہ رکن رکین بھی رہے ہیں، دقت نظر اور وسعت معلومات نے اس کتاب کو دستاویزی حیثیت دے دی ہے، ندوہ کی عصری معنویت، تحریک ندوہ اور عقیدہ ختم نبوت اور اسلامی ثقافت و مسائل و حقائق جیسے موضوعات اور اساطین ندوۃ العلماء کے تذکروں نے کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں، مولانا واضح رشید ندوی کا یہ احساس قطعی برحق ہے کہ ندوۃ العلماء کی تابندہ فکر اور اس کے عالی مقام حاملین کا تذکرہ آج کے بگڑے ہوئے ماحول کے لیے خضر راہ ثابت ہوگا۔

بررسی ادبیات امروز ایران: از پروفیسر محمد استعلامی، مترجم ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۵۲، قیمت ۱۶۴ روپے، پتہ:

ایجوکیشنل بک ہاؤس ،مسلم یونیورسٹی مارکیٹ ،علی گڑھ اور مکتبہ جامعہ لمٹیڈ ،شمشاد مارکیٹ علی گڑھ۔

ایرانی ادبیات کے شائق ،ہندوستان میں اب بھی کم نہیں ہیں ،کلاسیکی فارسی شعروادب کی حکمرانی ماضی میں ایسی رہی کہ آج بھی اردو ادب اسی کی سلطانی کا خطبہ پڑھتا نظر آتا ہے ،البتہ جدید اور معاصر ادب سے فارسی ادب سے واقفیت یا ازکم شناسائی میں پہلے جیسی بات نہیں ،لیکن زیرنظر کتاب کی ابتدائی تحریر سے یہ حیرت اور فزوں ہوئی کہ خود ایران میں عرصہ تک معاصر ادب سے بے اعتنائی برتی گئی ،مصنف کتاب محمد استعلامی ایران کے مشہور استاد اور محقق اور صاحب تصانیف کثیرہ ہیں ،تہران سے کناڈا تک وہ فارسی زبان کی تدریس سے وابستہ رہے ،یہ کتاب ان کی مقبول ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جو ایرانی کالجوں کے طلبہ کی بنیادی نصابی ضرورت کی وجہ سے لکھی گئی ،اس کا پہلا مقالہ فارسی ادبیات کے کلاسیکی ادوار کے عنوان سے بحیثیت مقدمہ کے ہے اور اس سے فاضل مصنف کی ژرف نگاہی ظاہر ہوتی ہے ،سطر سطر پر معلومات کا ایک دفتر موجود ہے ،موجودہ ایرانی زبان کی قدامت کو تین ہزار سال کی عمر دیتے ہوئے وہ اس کے ابتدائی لیکن مٹے ہوئے نقوش کا ذکر کرتے ہیں کہ آج کی کردی زبان کی بنیاد عہد ماد کی زبان ہے لیکن اب اس کا کہیں کوئی سراغ نہیں ،فارسی باستان اور اوستائی کا فرق کیا ہے ،ساسانیوں نے زرتشتی خط سے کیسے مختلف اسلوب اور قلم پیدا کیے اور آغاز اسلام کی صدیوں میں ساسانی پہلوی کی کتابیں تو موجود ہیں لیکن اسلام کے بعد کی کسی فارسی کتاب کا پتا نہیں چلتا ،ایسے اشکالات کے جواب واقعی دلچسپ ہیں ،فارسی زبان میں سادہ نویسی کے باب میں مصنف کا یہ اقرار ہندوستانیوں کے لیے باعث حیرت بھی ہے اور مسرت بھی کہ سادہ نویسی کا اظہار ابوالفضل سے شروع ہوا ،چودھویں صدی ہجری کے آغاز کا زمانہ غالباً زمانہ انقلاب ہے اس عہد کا ادب اور داستان نویسی اور پھر معاصر ایرانی شاعری ،ڈرامہ نویسی اور بچوں کا ادب جیسے مباحث سے اس کتاب کے عنوان سے پورا انصاف کیا گیا ہے ،لائق مترجم قارئین معارف کے لیے محتاج تعارف نہیں ،ان کی فارسی سخن گوئی کا تو زمانہ معترف ہے لیکن ترجمہ نگاری میں ان کی صلاحیت بلکہ مہارت خوب ظاہر ہوئی ،مشتملات میں ابواب کے ساتھ عناوین ہوتے تو یہ فہرست اور مفید ہو جاتی۔

ع ۔ ص

رسید مطبوعہ کتب

۱- **آداب وفضائل درود وسلام ملحقہ روح کائنات**: ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔ قیمت ۹۰ روپے۔

۲- **اقبال کا ایک ممدوح، بھرتری ہری**: تحقیق وترجمہ پروفیسر عبدالستار دلوی، دائرۃ الادب ۳- نیودیپ سوسائٹی، باندرہ ریکلمیشن ممبئی۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔

۳- **بچوں کی صحافت کے سوسال**: ضیاء اللہ کھوکھر، عبدالمجید کھوکھر، یادگار لائبریری گوجرانوالہ۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔

۴- **شبلی سخنوروں کی نظر میں**: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ اور دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ قیمت ۳۰۰ روپے

۵- **علامہ فضل حق اور انقلاب ۱۸۵۷ء**: یٰسں اختر مصباحی، دارالقلم، ذاکرنگر نئی دہلی۔ قیمت ۶۰ روپے۔

۶- **علیم صبا نویدی کی نعتیہ شاعری**: ڈاکٹر راحت سلطانہ، نشاط پبلیشرز، ۲۲۶/۹-۴-۲۰ محبوب چوک، حیدرآباد۔ قیمت ۲۰۰ روپے۔

۷- **عہد نبوی کے غزوات وسرایا اور شہدائے اسلام (حصہ دوم)**: مولانا انوار احمد صاحب اعظمی خیرآبادی، جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ۔ قیمت درج نہیں۔

۸- **قرآن منظوم (جلد پنجم)**: پروفیسر محمد سمیع اللہ اسد، دارالاشاعت اسلامیہ ۸۷/ مولانا شوکت علی اسٹریٹ (کوموٹولہ) کولکاتا-۷۳۔

۹- **مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ حیات وخدمات، اوصاف وکمالات**: محمد عبدالرشید (ریاض)، کمپیوٹر اردو کتابت سنٹر، ندوی منزل، ندوہ روڈ لکھنؤ-۷۔ قیمت ۶۰ روپے۔

۱۰- **نصیرالدین ہاشمی حیات اور ادبی خدمات**: پروفیسر محمد افضل الدین اقبال، مکان نمبر ۸۵۵-۳-۱۱، نیو ملے حیدرآباد۔ قیمت ۲۵ روپے۔